چھٹا باب: عابد سہیل کی دیگر غیر افسانوی نگارشات

الف: ادبی صحافت (ماہنامہ کتاب کے حوالے سے)

ب: علیم شناسی

- عبدالعلیم کی منتخب تحریریں
- ہندوستانی ادب کے معمار: عبدالعلیم (مونوگراف)
- علیم شناسی

☆ادب وصحافت میں فرق اور ادبی صحافت کی تعریف

صحافت اور ادب میں جتنا گہرا رشتہ رہے اتنا ہی واضح فرق بھی ہے۔ انگریز قلمکار میتھیو آرنلڈ نے صحافت کو "جلدی میں لکھے گئے ادب" سے تعبیر کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے"Journalism is a literature in a Hurry" لیکن جب صحافت اور ادب کے تشکیلی عناصر پر نظر ڈالی جائے تو یہ ادب سے بہت مختلف نظر آتا ہے۔ صحافت میں وہی لکھا جاتا ہے جس کا حقیقت سے واسطہ ہو ساتھ ہی جس واقعہ کی روداد بیان کی جارہی ہو اس میں تخیلاتی کارفرمائی خبر کو قصہ گوئی میں نہ تبدیل کردے۔ جیسا واقعہ پیش آیا ہے اسے بغیر کسی کمی وبیشی کے ساتھ بیان کردینا صحافت کا بنیادی اصول ہوتا ہے۔ مگر ادب اِن قیود سے مبرا ہے یہاں خیالات کی آزادی اور واقعہ بیانی میں تخلیق کی فنکاری کی مکمل چھوٹ ہے۔ ساتھ ہی لسانی نقطہ نظر سے ایک بنیادی فرق قابل غور ہے جس کی طرف ڈاکٹر وزیر آغا نے اشارہ کیا ہے

> "۔۔۔یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ ادب کی حیثیت مستقل ہے، اور صحافت کی حیثیت محض ہنگامی، لیکن ادب اور صحافت کا فرق "مواد" اور "موضوع" تک ہی محدود نہیں۔ دراصل اس کا نمایاں فرق وہ طریقہ اظہار ہے جو ادب اور صحافت کو صحافت کا درجہ عطا کرتا ہے۔"(۱)

صحافت میں زبان بڑی سادہ اور عام فہم استعمال کی جاتی ہے اس کے اسلوب میں یک رنگی ہوتی ہے یعنی نہ تشبیہوں استعاروں کا استعمال ہوتا ہے اور نہ مرصع و مسجع الفاظ سے عبارت کی تزئین کاری کی جاتی ہے۔ جب کہ ادب کی زبان میں تشبیہ اور استعارے اس میں حسن پیدا کرتے ہیں اور اس کی عبارت آرائی اپنا الگ لطف رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک فرق یہ بھی ہے کہ اخبار میں لکھنے والے کو مقررہ وقت پر کے ساتھ تحریر مکمل کرنا ہوتی ہے جب کہ ادیب اپنی تخلیق کے لئے وقت کا پابند نہیں ہوتا وہ افسانہ، ناول یا غزل کو جتنے دن میں چاہے مکمل کرے۔ نیز صحافت زمانہ کے ساتھ مقید ہوتی ہے، زمانہ گزشتہ کی خبر موجودہ اخبار میں جگہ نہیں پاتی جبکہ ادبی صحافت میں قلمکار کو اپنے جذبات کا آزادانہ اظہار کرنے کی اجازت ہوتی ہے وہ کسی بھی واقعہ سے متاثر ہو کر اسے اپنے ڈھنگ، رنگ، اسلوب و زبان اور کسی بھی زمان میں بیان کرسکتا ہے۔ ان تمام تفریقات کے بعد جب ہم "ادبی صحافت" پر نظر کرتے ہیں تو یہ ان ہی دو الفاظ یعنی "ادب" اور "صحافت" سے مرکب ہے جن کے سلسلہ میں متغائر

عناصر کی وضاحتیں پیش کی گئیں۔

یہاں "ادبی صحافت" سے مراد اگر ہم یہ لیں کہ ایسی صحافت جس میں ادب پایا جائے تو یہ ممکن نہیں کیونکہ ادب کی زبان وموضوع، صحافت کی زبان اور موضوع سے بالکل جدا ہے لہٰذا یہاں "ادب" کے ساتھ "صحافت" کے لاحقہ کی مدد سے ادب کو وقت کے ساتھ قید کیا گیا ہے۔ یعنی "ایک معین وقت پر پابندی کے ساتھ کچھ ادبی کاوشوں کو منظر عام پر لانے کا نام "ادبی صحافت" ہے"۔ اب یہ وقت یک ماہی، سہ ماہی یا شش ماہی کسی بھی شکل میں ہوسکتا ہے۔

☆مختصر تاریخی جائزہ

صحافت (یعنی اخبارات وغیرہ) اور ادبی صحافت (یعنی مجلّے، رسائل ماہنامہ وغیرہ) دونوں سے قاری کا رشتہ بڑا گہرا ہوتا ہے دونوں کی قرأت قاری کے علم میں اضافہ کا باعث بنتے ہیں اور زمانہ کے کئی خفی پہلو جلی ہوکر سامنے آجاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ دنیا میں، خصوصاً ہندوستان کی تاریخ میں (جب سے اخبار ورسائل کی اشاعت عمل میں آئی ہے) جتنے بھی بڑے انقلابات سامنے آئے ہیں ان میں ایک بڑا حصہ صحافت یا ادبی صحافت کا رہا ہے۔

ہندوستان میں صحافت کا آغاز انگریزوں کے زمانہ اقتدار میں ہوا تھا۔ یہاں جیمس اگسٹس ہکّی نے 29 جنوری 1780 میں پہلا ہفتہ وار اخبار ہکیز بنگال گزٹ یا کلکتہ ایڈورٹائزر کے نام سے شروع کیا۔ اس اخبار میں سیاسی خبروں کے علاوہ سرکاری نوٹس رہتے تھے اور مضامین ایسے ہوتے جس میں کمپنی اور برطانوی اعلیٰ حکام کی کج روی کی طرف اشارے ہوتے۔ اس کے سرورق پر لکھا ہوتا

> "ہفتہ وار سیاسی اور تجارتی اخبار ہے جس کے صفحات ہر پارٹی کے لئے کھلے ہوئے ہیں لیکن اخبار کو کسی پارٹی سے تعلق نہیں" (۲)

اس اخبار کے نوکیلے نشتر کو حکومت زیادہ دن تک برداشت نہیں کرسکی نتیجتاً 1782 کو یہ اخبار ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا۔ اس اخبار کی اشاعت تو رک گئی لیکن یہ ہندوستان کے لئے صحافت کی راہ کا ہادی وراہنما بن گیا۔ "بنگال گزٹ" کی اشاعت سے متاثر ہوکر انڈیا گزٹ (نومبر 1780)، کلکتہ گزٹ (4 مارچ 1784)، بنگال جرنل (1785)، انڈین ورلڈ (1791)، بنگال ہرکارو (1795) اور ایشیاٹک مرر (1799) وغیرہ اخبار منظر عام پر آئے۔ ہندوستان کی بنگلہ زبان میں پہلی بار ڈگ درشن کے نام سے ایک ماہنامہ اپریل 1818 میں شائع ہوا یہ سی رام بپٹسٹ مشنری کی پریس سے شائع ہوتا تھا۔ اس پر شروع میں حکومت نے سخت نگرانی کی۔ یہ ماہنامہ پوری طرح سے سرکاری تھا اور اس میں سرکاری اشتہارات وغیرہ شائع ہوتے تھے۔ جب حکومت نے اس پرچہ پر کوئی اعتراض نہیں کیا تو ڈاکٹر جوشا مارش مین جو ڈگ درشن کے بانیوں میں تھے انھوں نے ایک "سماچار درپن" کے نام سے ایک

ہفتہ روزہ اخبار 23 مئی 1818 کو شائع کیا جس کا سلسلہ 1839 تک قائم رہا۔

1822 سے 1857 کے درمیان ملک کے مختلف حصوں سے اردو اور فارسی زبان میں رسالے نکلنے شروع ہوگئے تھے یہاں تک کہ یہ سلسلہ دلی کالج تک پہنچا۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے جب دلی کالج میں پرنسپل کا عہدہ سنبھالا تو طلبا کی تعلیمی صورت حال کو بہتر بنانے، سادہ اور سلیس اردو زبان کو رواج دینے کے لئے 'مطبع العلوم' پریس قائم کیا۔ اسی پریس سے انھوں نے ہفت روزہ مصور مجلہ 'قرآن السعدین' 1845 میں جاری کیا جسے بعض حضرات اخبار بھی کہتے تھے۔ یہ مجلہ مستقبل کے مجلّات کے لئے راہنما ثابت ہوا۔ خود ڈاکٹر اسپرنگر کی زبانی ملاحظہ کیجئے

> ''1845 میں میں نے پے نی میگزین کی طرز پر ایک باتصویر موقت رسالے کی بنیاد ڈالی۔ اس کا نام قرآن السعدین تھا۔ گویا مشرق ومغرب، مشتری اور زہرہ تھے جن کا قرآن اس رسالے میں ہوا تھا۔ یہ اپنی قسم کی پہلی کوشش تھی۔ گیارہ برس بعد جب میں ہندوستان سے رخصت ہوا تو دیہ دیکھ کر مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ اس کی تقلید میں بارہ سے زیادہ رسالے نکل رہے تھے۔'' (۳)

اردو صحافت کا آغاز ''جام جہاں نما'' سے 27 مارچ 1822 کو کلکتہ سے ہوا۔ اس کے مدیر منشی سدا سکھ مرزا پوری تھے جو پہلے سماچار چندریکا سے منسلک رہ چکے تھے۔ یہ ایک ہفتہ وار اخبار تھا۔ جس کی پرنٹ لائن پر یہ عبارت رہتی تھی

> '' کلکتہ مقام کے بیچ مشن پریس چھاپے خانے میں چھاپا گیا'' (۴)

نادر علی خاں نے اپنی کتاب اردو صحافت کی تاریخ میں مختصر حوالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ اس اخبار کا آغاز اردو زبان میں ہوا تھا لیکن 5 مئی 1822 میں ایک فارسی کالم کی اشاعت کو اتنا پسند کیا گیا کہ صرف دو مزید شماروں کے بعد اس کی زبان فارسی کر دی گئی۔

اسی دوران راجہ رام موہن رائے نے 20 اپریل 1822 کو ایک فارسی اخبار ''مراۃ الاخبار'' شائع کرنا شروع کیا اور اشاعت کے اغراض ومقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا

> '' ایڈیٹر عوام کو مطلع کرتا ہے کہ اس ملک میں اخبار بیں طبقہ کے لئے بہت سے اخبار شائع ہوتے ہیں لیکن اب تک فارسی کا کوئی اخبار شائع نہیں ہوا جس سے ان لوگوں کو عموماً جو انگریزی سے ناواقف ہیں اور شمالی ہند والوں کو خصوصاً خبریں معلوم ہوسکیں چنانچہ وہ ایک فارسی اخبار کے اجرا کا کام شروع کر رہا

ہے۔"(۵)

اس اخبار میں خبروں کے علاوہ تبصرے اور عوامی بیداری سے متعلق تحریریں شائع ہوتی تھیں۔ 1833 میں حکومت کے ذریعہ پریس قانون لاکر اخبار کی آزادی پر قدغن لگانے کی کوشش کی گئی تو راجہ رام موہن رائے نے اس کی مخالفت میں سپریم کورٹ سے لیکر برطانوی شہنشاہ تک اپلیں اور درخواستیں کی۔ مگر حکومت ہندوستان میں آنے والے صحافتی انقلاب کی آہٹ سن چکی تھی لہٰذا اس نے موہن رائے کی اپیلوں پر کان نہیں دھرا نتیجتاً راجہ رام موہن رائے نے بطور احتجاج اخبار کی اشاعت 1833 میں بند کردی۔

اردو خبار کے بعد اردو کے پہلے ماہنامہ رسالہ کی جستجو ہمیں "خیر خواہ ہند" تک لے جاتی ہے یہ رسالہ شمالی ہند کے مرزاپور سے 1837 میں آر سی ماتھر کی زیر نگرانی نکلتا تھا۔اس کے مالک ایف جی برایت تھے۔اس میں معلوماتی، سیاسی اور تاریخی مضامین کے علاوہ زیادہ تر تحریریں عیسائی مذہب کی ترویج کے لئے شائع ہوتی تھیں۔

مذکورہ بالا تمام اخبار یا ماہنامے ابھی اپنے وجود کے استحکام میں کاربند تھے لہٰذا یہاں ساری توجہ صرف بقائے حیات پر مرکوز تھی۔ کچھ عرصہ بعد جب اخبار کی اشاعت نے اپنی جڑیں مضبوط کیں اور عوام وخواص میں اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوا تب اخبار میں جدت اور اس کے مشمولات پر دھیان دیا جانے لگا۔اس کے تحت منشی سجاد حسین نے ایک منفرد طرز کا اخبار "اودھ پنچ" کی ابتدا کی۔ یہ طنزیہ اور مزاحیہ نوعیت کا ہفتہ وار اخبار 16 جنوری 1877 کو منظر عام پر آیا۔اس میں ہر طرح کے مضامین خبریں، تبصرے وغیرہ کے ساتھ کارٹون بھی شائع ہوتے تھے۔مشہور زمانہ ناول فسانہ آزاد کی قسط وار اشاعت اسی نے کی تھی اور حالی کی مقدمہ شعر وشاعری کے خلاف مضامین کو بھی اسی اخبار میں جگہ ملی تھی۔

ان ادبی تحریروں کی اشاعت میں اہم کردار ان گلدستوں نے بھی ادا کیا ہے جن میں مختلف مشاعروں میں پیش ہونے والا کلام شائع کیا جاتا تھا۔اس کا آغاز مولوی کریم الدین نے 1845 میں "گل رعنا" نکال کر کیا تھا۔اس میں وہ اپنے یہاں مشاعرے میں پیش ہونے والے کلام اور ادبی وعلمی مضامین شائع کرتے تھے۔اس کی اشاعت وہ اپنے ذاتی مطبع "رفاہ عام" دہلی سے کرتے۔ پندرہ روزہ اس گلدستے نے اردو اشاعتی مواد میں ادبی تحریروں کو جگہ دینے کی تحریک چلائی جس کے نتیجہ میں پرواز، گلشن داغ، خدنگ نظر وغیرہ گلدستے منصۂ شہود میں آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے اردو کے جرائد میں اضافہ ہونے لگا۔

ادبی تحریروں کی اشاعت کے بڑھتے ہوئے رجحان نے سرسید کے اصلاحی رسالے تہذیب الاخلاق میں بھی اپنی جگہ بنالی۔ اگرچہ یہ رسالہ انھوں نے انگلستان کے پرچے اسپیکٹیٹر اور ٹیٹلر سے متاثر ہوکر اپنی قوم کو

سدھارنے اوران میں سیاسی ،سماجی اورتعلیمی بیداری کے لئے نکالا تھالیکن اس کی اشاعت میں ادبی مضامین بھی شامل کر لئے جاتے تھے اورایسا اس لئے ممکن ہوا کیونکہ ادب سماج کا ہی حصہ ہے اور سماج میں پیدا ہونے والی برائیوں وتبدیلیوں کا آئینہ دار۔

اس ماہنامہ رسالہ کا پہلا شمارہ یکم شوال 1287 ہجری مطابق 24 دسمبر 1870 عیسوی میں شائع ہوا۔ تہذیب الاخلاق کے پہلے مہتمم منشی مشتاق حسین تھے اس کے بعد حافظ محمد عبدالرزاق اور پھر خود سرسید احمد خاں نے اس کی ذمہ داری سنبھالی۔ یہ رسالہ ان کی زندگی میں تین بار بند بھی ہوا جس کی وجہ سرسید کی بے انتہا مصروفیت تھی۔ آخر کار یہ 1897 میں "انسٹی ٹیوٹ گزٹ" میں شامل کر دیا گیا۔سرسید کے انتقال کے ساتھ ہی اس کی اشاعت بھی رک گئی۔لیکن 90 سال بعد سید حامد کی کوششوں سے فروری 1982 سے اس کی دوبارہ اشاعت ممکن ہوسکی جس کا سلسلہ تا حال جاری ہے۔ اس رسالہ کا ہندی ایڈیشن کا اجرا "نشانت" (اندھیرے کا خاتمہ) کے نام سے مارچ 1985 سے ہوا۔

اسی زمانے کا ایک قابل ذکر رسالہ عبدالحلیم شرر نے "دلگداز" کے نام سے جاری کیا۔ یہ رسالہ ابتدائی دور میں سولہ صفحات پر مشتمل تھا پھر صفحات کی تعداد 32 ہوگئی جس میں 16 صفحات تاریخی ناول کے لئے مختص تھے۔ یہ رسالہ 1887 سے 1909 تک مسلسل ادبی صحافت کوفروغ دیتا رہا۔رومانوی تحریک کا علمبردار ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں بیش قیمتی ادبی مضامین شائع ہوتے۔"معرکہ چکبست وشرر" کے عنوان سے شائع ہونے والے مضامین بھی اسی رسالہ میں شائع ہوئے تھے جس میں ادبی چشمک اور علمی معرکوں کا حسن موجود ہے۔اس کے علاوہ علی گڑھ سے مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی کی ادارت میں نکلنے والا معارف (1898)،لاہور سے نکلنے والا مخزن، زمانہ، (1903)،اردو معلیٰ (1903 علی گڑھ)،دکن ریو (1903 حیدر آباد)،الندوہ (1904 شاہجہاں پور)،خاتون (1904 علی گڑھ)،عصمت (1908 دہلی)،صبح بہار (1906 میسور)،ادیب (الہ آباد 1910)،اردو (1921 مولوی عبدالحق)، ہمایوں (1922 میاں بشیر احمد)،نگار (1922 نیاز فتحپوری)،ادبی دنیا (1922 تاجور نجیب آبادی) اور نیرنگ خیال (1924 حکیم محمد یوسف حسن) وغیرہ ورسالوں نے اس روایت کو بڑے مخلص اور بہترین انداز سے آگے بڑھایا۔ یہ ابتدائی رسالے ادبی صحافت کے لئے راہ ہموار کر رہے تھے نتیجتاً دیکھتے ہی دیکھتے پورے ہندوستان میں ادبی رسالوں کی اشاعت کی تعداد سیکڑوں تک پہنچ گئی۔

☆ماہنامہ کتاب کا آغاز

لکھنؤ علم وادب کا گہوارہ رہا ہے لہٰذا یہ کیسے ممکن تھا کہ ادبی رسالوں کی چھاپ یہاں نظر نہ آتی۔عبدالعلیم شرر کے دلگداز کے بعد نوبت رائے کا خدنگ نظر(1896)، جوش کی سرپرستی میں نکلنے والا رسالہ نیا ادب، جوادی زیدی کی ادرت میں 1946 سے نکلنے والا رسالہ نیا دور وغیرہ معیاری رسالے تھے جن کی اشاعت نے ادبی ذوق کو پروان چڑھایا۔ان سب کے درمیان دسمبر 1962 سے لیکر جولائی 1975 تک نکلنے والے ماہنامہ رسالہ 'کتاب' کا اپنی علیحدہ شناخت قائم کرنا رسالہ کے معیاری ہونے کا ثبوت ہے جس کو عابد سہیل جیسے صحافی کی سرپرستی حاصل تھی جو قومی آواز کے بعد نیشنل ہیرالڈ میں اپنی خدمات انجام دے رہے تھے۔عابد سہیل ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے مگر ان کا رسالہ ماہنامہ 'کتاب' کسی نظریہ کا پابند نہیں تھا اس میں ہمیشہ صحتمند ادبی مضامین اشاعت پذیر ہوتے رہے۔بزبان عابد سہیل کتاب کے اغراض ومقاصد ملاحظہ ہوں

> ''کتاب ایک خاص متوازن ماہنامہ تھا ترقی پسند لیکن کسی قسم کی انتہا پسندی سی کوسوں دور، روشن خیال لیکن صحتمند ادبی اور سماجی روایات کے چوکھٹے سے گھرا ہوا۔اردو کے حقوق کے لئے سینہ سپر لیکن ہندوستان کی دوسری زبانوں کے اعلیٰ ادب اور عالمی شاہکاروں کو تراجم کے ذریعہ اردو کے قارئین تک پہنچانے کے لئے بے تاب۔''(۶)

اس زمانے میں رسالہ نکالنا آسان مگر اس کی سلسلہ وار اشاعت کا برقرار رکھنا کسی کوہ گراں کا بار برداشت کرنے سے کم نہ تھا۔عابد سہیل اس بار کے وزن کو خوب سمجھتے تھے اسی لئے انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے

> "غیر ذمہ داری، گپ بازی، اچھے کاموں میں روڑے اٹکانا ہمارا قومی کردار بن گیا ہے "کتاب" سے فائدہ نہ ہوتا تو جاری کیسے رہتا، "کتاب" کتابوں کی نکاسی کا ذریعہ ہے۔ارے کون خسارہ کا سودا کرتا ہے۔اس زمانے میں سب کہنے کی باتیں ہیں۔یہ جملے ان لوگوں کے ہیں جنہیں نہیں معلوم کتاب کا خرچ کیا ہے، کاغذ کس حساب سے بازار میں فروخت ہوتا ہے، طباعت کس نرخ پر ہوتی ہے، ڈاک کے اخراجات کیا ہیں، کتنے پرچے اعزازی جاتے ہیں، کتنے

> خریدار وی پی واپس کر دیتے ہیں، اور کتنے ایجنٹ رقم ہضم کر کے ڈکار بھی
> نہیں لیتے۔''(۷)

شاید اسی لئے جب عابد سہیل نے عصمت چغتائی سے قلمی تعاون کا مطالبہ کیا تو عصمت چغتائی نے جواباً کہا ''افسانہ تو میں بھیج دوں لیکن رسالہ نکلے گا کتنے دن'' مگر جب عابد سہیل کے عزم محکم نے اس رسالوں کو سال سوا سال کی عمر تک پہنچایا تو عصمت نے اپنا افسانہ ''سانپ کے تلوے'' اس جملہ کے ساتھ عابد سہیل کو روانہ کیا ''کتاب کی بے غیرتی سے تنگ آ کر افسانہ بھیج رہی ہوں کمبخت بند ہی نہیں ہو چکتا''

اس پرچہ کا آغاز اتفاقی طور پر ہوا عابد سہیل کی جانب سے کسی رسالے کی اشاعت کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لکھنؤ میں عابد سہیل کے ساتھ ایک زمانے تک ان کی والدہ اور چھوٹے بھائی بہن رہتے تھے۔ سب زیر تعلیم تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی عمران کا دل پڑھائی میں نہیں لگتا تھا۔ ایک دفعہ عابد سہیل نے کسی بات پر انھیں سخت لہجے میں ڈانٹ دیا جس کا برا مان کر عمران نے نیند کی گولیاں کھالیں۔ طبیعت اتنی خراب ہوگئی کہ انھیں رات میں ہی میڈیکل کالج میں دخل کرانا پڑا۔ یہ اطلاع جب ان کے دوست محمد اشفاق کو ملی تو انھوں نے سارا معاملہ سننے کے بعد عمران کے لئے ایک اشاعتی ادارہ کھولنے اور ماہنامہ رسالہ کے اجرا کا مشورہ دیا۔ چونکہ یہ کام عابد سہیل کی دلچسپی کا تھا لہٰذا انھوں نے اس کے لئے حامی بھر لی۔ اور کتاب پبلی شرز کے نام سے اشاعتی ادارہ اور اسی نام سے ایک ماہانہ رسالہ کا قیام عمل میں آیا۔ ان کے چھوٹے بھائی نے اس کام کے بجائے ایک وزیر سے ملنے والی کنڈکٹری کو ترجیح دی۔ اس اشاعتی کاروبار میں عابد سہیل پانچ، چھ ہزار روپۓ لگا چکے تھے لہٰذا اس کو ختم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور اس طرح عابد سہیل اشاعتی کاروبار سے جڑ گئے۔

> ''مجھے خوش پوشی کا شوق تھا وہ ''کتاب'' کے لئے تج دی، مہینے میں دو چار بار کافی
> ہاؤس چلا جاتا تھا، وہ بھی چھوڑ دیا، یہ سب کسی قسم کی قربانی نہ تھی۔ ''کتاب'' میرا
> شوق تھا''(۸)

جب ماہنامہ کتاب کی اشاعت کا فیصلہ ہوا تو عابد سہیل نیشنل ہیرالڈ سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اپنا نام بطور مدیر نہیں دے سکتے تھے لہٰذا انہوں نے اپنے ایک دوست عبدالحلیم خاں کے گھر کی ملازمہ کے بیٹے جمیل احمد کو اس کا مدیر مقرر کیا مگر بقول عابد سہیل جمیل احمد طویل عرصہ تک کتاب کے ایڈیٹر رہے لیکن کتاب اور وہ ایک دوسرے کے لئے بس دور کا جلوہ تھے۔ ستمبر 1968 سے اس جگہ پر شمیم الدین کا نام جانے لگا ان کا بھی تعلق اس کتاب سے برائے نام ہی رہا۔ مجلس مشاورت میں عابد سہیل نے احتشام حسین اور حیات اللہ انصاری سے درخواست کی اور ان

دونوں حضرات کی رائے پر اپنا نام بھی شامل کرلیا۔اس کے علاوہ قمر رئیس، سہیل عظیم آبادی اور رام لعل نے بھی اس رسالے میں غیر معمولی تعاون کیا۔ان سب کے باوجود" کتاب" کے لئے مضامین کی جمع آوری سے لیکر اشاعت تک ساری ذمہ داری خود عابد سہیل ہی کرتے۔بقول مصنف

"ایک عرصے تک ادارت سے لے کر چپراسی تک کے سارے کام میرے ہی ذمہ تھے"۔(۹)

اشاعت کے وقت اس کی سالانہ قیمت چار روپے اور فی پرچہ 35 نئے پیسے مقرر کی گئی تھی پھر ایک روپے اور ستمبر 1971 میں ایک روپے بیس پیسہ فی پرچہ اور زرسالانہ 12 روپے ہو گیا تھا۔

☆☆☆

☆ کتاب کی مقبولیت کے اسباب

1960 اور اس کے بعد کی تقریباً دو دہائیاں ادب کے حوالے سے بڑی اہم مانی جاتی ہیں اس زمانہ میں ادب کے سمندر میں تجربات و رجحانات اور تحریکات کی موجوں نے تلاطم مچا رکھا تھا ایسی صورت میں رسالہ کے اعتدال کو برقرار رکھنا اور غیر جانبداری کے ساتھ تحریروں کو شائع کرنا نہایت مشکل امر تھا۔عابد سہیل چونکہ ایک تجربہ کار صحافی تھے اور تحریروں کو بہتر و معیاری بنانا خوب جانتے تھے لہٰذا انہوں نے کتاب کو' یک رجحانی' نہ بننے دیا جس کا اندازہ پہلے شمارہ کے مشمولات ہی سے ہوجاتا ہے۔'کتاب' کا مقصد تمام اصناف ادب کو یکساں طور پر مقبولیت سے ہمکنار کرانا تھا۔48 صفحوں پر مشتمل اس شمارہ میں مختصر افسانے، طنزیہ، غزلیں، نظمیں، مضامین، معلوماتی مضامین، بحث اور محل نظر عنوانات کے تحت کرشن چندر، علی عباس حسینی، احمد جمال پاشا، اثر لکھنوی، منظر سلیم، من موہن تلخ، قتیل شفائی، احتشام حسین، ٹی این چک، بشیر بدر وغیرہ جیسے پایہ کے ادباء وشعرا کی تحریریں شامل ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اشاعت کے بعد ہی سے کتاب کو عوامی مقبولیت ملنا شروع ہوگئی صرف دو تین شمارے کے بعد ہی اس کی ضخامت میں اضافہ ہوگیا صفحات کی تعداد 56 تک پہنچ گئی۔

کتاب رسالہ نے اردو ادب کے فروغ میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی بہت سی ایسی منظوم و منثور تحریریں بھی شائع کیں جو غیر مطبوعہ تھیں اس سلسلہ کی شوکت تھانوی کی دو تحریریں شوکت تھانوی نمبر میں شائع کیں جو عابد سہیل نے لاہور ریڈیو اسٹیشن سے بڑی کاوشوں کے بعد حاصل کی تھیں۔قرۃ العین حیدر کا مشہور افسانہ 'ملفوظات باباجی

گل بیگتاشی' اور راجندر سنگھ بی کا افسانہ "متھن" پہلی بار اسی میں شائع ہوا نیز کرشن چندر، قاضی عبدالستار، علی عباس حسینی اور حیات اللہ انصاری وغیرہ کے بیشتر افسانے کتاب کی اشاعت کے دوران سب سے پہلے اسی میں شائع ہوتے۔ کتاب نے ادبی نمبر کی اشاعت بھی بڑے اہتمام سے کی صرف اردو زبان ہی نہیں بلکہ دیگر زبانوں کے ادب کو اردو کے قالب میں ڈھال کر اردو ادب کے سرمایہ میں گرانقدر اضافے کئے۔ اس کا آغاز ہندی کہانی نمبر سے ہوا اس خاص نمبر میں شامل ہونے والی ہندی کہانیوں کا انتخاب مشہور ہندی افسانہ نگار پرساد سنگھ نے کیا اور تراجم ادارہ کی جانب سے کرائے گئے۔ اس نمبر نے اردو ہندی ادب کے درمیانی رشتہ کو مستحکم کیا۔ اس خاص نمبر کے بعد مراٹھی کہانی کا بھی ایک نمبر شائع کیا گیا ان کہانیوں کا انتخاب اور ترجمہ نور پرکار نے کیا بعد میں یہ افسانے 'سبزۂ بیگانہ'' کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوا، ان کے علاوہ اردو افسانہ نمبر، علی عباس حسینی نمبر، شوکت تھانوی نمبر بھی بڑے مقبول ہوئے۔ کتاب نے خاص گوشوں کی اشاعت بھی کی جن سے ادبی شخصیتوں کے احوال وفن سے آشنا ہونے کا موقع میسر ہوا۔ ان میں گوشہ مصطفی زیدی، احتشام حسین، سجاد ظہیر، کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی کو کافی پسند کیا گیا۔

عابد سہیل نے رسالہ کتاب کے معیار و وقار کو ہمیشہ برقرار رکھا نہ کسی کے رعب میں آ کر اصولوں کو تبدیل کیا اور نہ کسی جذبات واحساسات کے تحت انتہا پسندی سے کام لیا۔ ایک دفعہ باقر مہدی نے ایک نظم اور دو غزلیں بھیجیں وہ چاہتے تھے کہ نظم دو صفحات پر چھاپی جائے اور غزلیں ایک ایک صفحہ پر۔ لیکن عابد سہیل نے باقر مہدی سے معاملات کے بگڑ جانے کی فکر کئے بغیر اسے اپنی سہولت کے اعتبار سے شائع کیا۔ دوسری جگہ عابد سہیل لکھتے ہیں

> ''کتاب نے تخلیقات کے انتخاب کے سلسلہ میں کبھی کوئی سمجھوتہ نہیں کیا راجہ مہدی علی خاں کی ایک نظم کی اشاعت سے معذوری ظاہر کی تو انہوں نے وہی نظم پنجاب کے ایک مشہور جریدے کے خاص نمبر میں چھپوا کر رسالہ رجسٹری سے مجھے بھیجا ساتھ میں نئی نظم بھی تھی۔ جواب میں انھیں لکھا گیا کہ پنجاب کے رسائل کو جو آزادیاں حاصل ہیں وہ افسوس 'کتاب' کو حاصل نہیں ہیں۔'' (۱۰)

'کتاب' کی مقبولیت اور اس کے وقار کی عظمت کا ایک سبب یہ بھی رہا کہ عابد سہیل نے قاری کے جذبات اور عقیدت کا ہمیشہ خیال رکھا کتاب کے مشمولات سے کسی کی دل آزاری نہ ہو اس کی سختی سے پابندی کی۔ ایک دفعہ کوثر چاند پوری کے افسانہ 'چور راستے' پر کچھ لوگوں نے اعتراض کیا تو کتاب کے دوسرے شمارے میں اس پر اظہار افسوس کر کے یہ باور کرایا کہ ادارہ کا مقصد کسی فرقہ یا فرد واحد کی دل آزاری کبھی نہ تھا۔ عابد سہیل نے کشادہ دلی کا

ثبوت دیتے ہوئے ان لوگوں کے تبصروں کو بھی اسی آب وتاب سے شائع کیا جس طرح وہ کتاب کی تعریف میں ملنے والے خطوط کو شائع کرتے تھے۔ کتاب میں "تلخ، تند وشیریں" کے تحت خالد شفائی (سندگڑھ) کی یہ رائے بھی شامل کرتے ہیں

"ایک معیاری ادبی جریدہ میں جو حسن اور خوبصورتی ہونا چاہئے، آپ کا پرچہ قریب قریب اس سے عاری ہے نہ تو ترتیب اچھی ہے اور نہ کتابت وطباعت میں کوئی دلکشی ہے، سب سے بڑی ستم ظریفی تو یہ ہے کہ اندرونی صفحات میں جا بجا جو "اسکیچز" دئے گئے ہیں وہ حد درجہ بھدے اور بدنما معلوم ہوتے ہیں، اس پر عنوانات مضامین کے حاشیے اور زاویے مستزاد! مجلس مشاورت کے بڑے ناموں کی موجودگی میں ان کوتاہیوں کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ سرورق بھی کوئی خاص نہیں ورنہ اس میں کوئی خوبی ہے۔ مواد کے انتخاب میں بھی کوئی سختی سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ بہر حال مجموعی طور پر پرچہ کی رفتار مایوس کن ہے اور یہ بات حیرت ناک ہے کہ پچھلے چند شمارے تازہ ایشوع سے بدرجہا بہتر تھے۔" (۱۱)

اسی کالم میں شمس الرحمان کا وہ تبصرہ ملتا ہے جس میں انھوں نے عابد سہیل کی صحافت پر طنز کیا ہے۔

"آپ نے یہ ضروری نہیں سمجھا کہ اقتدار عالم صاحب کا مضمون "داراشکوہ کا تاریخی پس منظر" اشاعت سے پہلے مجھ کو دکھالیں لیکن میرا مضمون (کتاب شمارہ 65) میری اجازت کے بغیر اقتدار عالم صاحب کو بھیج کر اور ان کا جواب بہ طور خاص شائع کر کے صحافت کا اعلیٰ معیار ائم کیا ہے۔" (۱۲)

عابد سہیل نے کبھی جانبداری کے ساتھ نہ تو کتاب میں کچھ شائع کیا اور نہ اس پر کسی خاص رنگ کو غالب آنے دیا۔ گوکہ وہ ترقی پسند تھے لیکن ان مضامین کو بھی اتنے ہی اہتمام سے شائع کیا جاتا تھا جو اس تحریک کی حمایت نہ بھی کر رہا ہو۔ ان کے نزدیک ہر وہ شخص جو سچی بات کہے قابل احترم ہے۔ کتاب لکھنؤ کے سالنامہ میں کتنے واضح الفاظ کا استعمال کرتے ہیں

۔۔۔ادیبوں کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جن کو انجمن کے طریق کار سے اور جس طرح کانفرنس طلب کی گئی ہے اس سے اختلاف اور شکایات پیدا ہوگئیں ہیں۔۔۔جن لوگوں نے انجمن کی جانب یہ رویہ اختیار کیا، انھیں انجمن

یا تحریک کا دشمن نہیں قرار دیا جا سکتا۔“۔(۱۳)

کتاب کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ عابد سہیل کی مساویانہ روی تھا۔انھوں نے کتاب کے صفحہ ہر کے لئے کھول دئے تھے جس میں ترقی پسند اور غیر ترقی پسند کے مابین کوئی فرق نہیں ہوتا۔اس کا واضح ثبوت ڈاکٹر عقیل رضوی کے نقطہ نظر کے خلاف محمود ہاشمی کے مضمون کی اشاعت کا ذکر ہے جو انھوں نے اپنی خودنوشت کے صفحہ 244 پر کیا ہے۔

☆عابد سہیل کی اداریہ نگاری

ایک بہترین اخبار یا رسالہ ایک مشن کے ساتھ اپنی زندگی کا آغاز کرتا ہے اور آخر تک اس مشن کی ترویج و اشاعت پر قائم رہنا ہی اسکا اصل مقصد ہوتا ہے۔ اگر کوئی رسالہ یا اخبار بند ہوجائے تو یہ اس کی موت نہیں بلکہ اپنے مقصد سے منحرف ہوجانا اصل موت کہلاتی ہے۔ اس اہم مسئلہ کی طرف عابد سہیل اپنے ایک اداریہ میں روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں

> ”ہر رسالہ کا، چاہے وہ کتنا ہی معمولی یا حقیر ہو، ایک حلقہ اثر ہوتا ہے اور کسی نہ کسی حیثیت سے اس کے سراہنے اور اسے پسند کرنے والے بھی پیدا ہو جاتے ہیں لیکن وہ رسائل جن کے پڑھنے والے اپنی نظر رکھتے ہیں کچھ امیدیں رکھ کر رسالہ کی ورق گردانی کرتے ہیں اور ہر اندراج میں رسالہ کی شخصیت کا عکس دیکھنا چاہتے ہیں ہمارا خیال ہے کہ وہ رسالہ جس کی کوئی شخصیت نہیں ہوتی، جس کا مزاج نہیں بن جاتا، قارئین کی نگاہ میں وقعت نہیں حاصل کرسکتا۔ کتابیں اور رسالے پڑھنے والوں کے رفیق ہوتے ہیں اور جس طرح ہم اپنے دوستوں کو ان کے مزاج، انداز نظر، رفتار و گفتار سے پہچانتے ہیں بالکل اسی طرح ہم رسائل سے بھی مانوس ہوجاتے ہیں اور ان سے اپنے جانے پہچانے مانوس معیار کی امید رکھتے ہیں۔“ (۱۴)

رسالہ یا اخبار میں اداریہ وہ حصہ ہے جس میں واضح طور پر یہ مشن اور مزاج جلوہ گر نظر آتا ہے اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سماج اور عوام میں اداریہ اور اداریہ نگاری کتنا اہم کام ہے۔ اس ذمہ داری کا حق ادا کرنے کے لئے کانٹوں بھری راہ سے گزرنا پڑتا ہے۔ عابد سہیل نے تقریباً ایک دہے تک اس راہ پر چلتے رہے اور اف تک نہ کی۔ آخر کے دو سال میں کچھ اداریہ احتشام حسین نے بھی لکھے وہ اداریئے کون سے تھے اس کی وضاحت نہیں ملتی۔ یہ اداریے ”پہلا ورق“، ”پہلا صفحہ“ اور ”اپنی بات“ عنوانات کے تحت ہوتے۔ عابد سہیل بھی اس کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے اس لئے انھوں نے اپنے اداریوں کو صرف ادبی حیثیت نہیں دی بلکہ سماج کے حساس عصری مسائل پر بے باکی کے ساتھ گفتگو کی۔ اس راہ میں انھوں نے ایک تجربہ بھی کیا اور 1967 جنوری کا شمارہ بغیر اداریہ کے شائع کردیا غالباً یہ پہلی دفعہ تھا کہ کوئی رسالہ بغیر ادریہ کے شائع ہوا ہو حالانکہ اس عمل میں ”کتاب“ کے صفحات میں جگہ کی

تنگی کو بھی دخل تھا لیکن بہرحال ایک نیا قدم اٹھانے کے لئے جرأت و ہمت کی ضرورت تو پڑتی ہی ہے اور وہ بھی ایسے وقت میں جب معاملہ ڈانواڈول ہو۔ لیکن عابد سہیل نے اس امر سے بھی ایک جدت پیدا کی اور آئندہ شمارے میں اداریہ نہ چھاپنے کو اسکے تئیں عوامی بیداری سے آشنا ہونے کی ایک وجہ قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں

> "گزشتہ جنوری کے شمارے میں ہم نے کوئی اداریہ شامل نہیں کیا تھا۔ جگہ کی کمی کے علاوہ اس کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ہم پہلا ورق کی ضرورت اور افادیت کے متعلق قارئین کا ردعمل معلوم کرنا چاہتے تھے۔" (۱۵)

عابد سہیل ان اداریوں کے ذریعہ ادبی دنیا میں ایک انقلاب لانا چاہتے تھے۔ وہ اپنے قارئین میں ہی رجحان پید کرنا چاہتے تھے کہ وہ اچھے اور معمولی ادب میں تمیز کر سکیں، بے روح اور حیات بخش تحریروں کے معیار معین کریں اور تہذیب اور تاریخ کی تعمیر میں ادب کے کردار کو سمجھیں۔ اس تعمیر میں وہ مدیر، مضمون نگار اور قاری کا مثلث قائم کرتے ہیں اور اس طرح اس امر مہم میں تینوں کو شریک کر لیتے ہیں۔ یہ عابد سہیل کے اداریہ نگاری کا کمال ہے کہ انھوں نے اس ایک اداریہ میں سماج کے تین اہم طبقوں کو خطاب کیا ہے۔ انداز تخاطب ملاحظہ فرمائیں

> "رسالہ کا مدیر اپنی سوجھ بوجھ اور اپنے ادب نقطہ نظر کے مطابق اور رسالہ کی شخصیت اور مزاج سے ہم آہنگ مضامین اور منظومات کا انتخاب اسی وقت کر سکتا ہے جب مضمون نگار اور شعرا بھی اس طرف توجہ کریں اور ہمیں مسائلِ حیات سے دست و گریباں ہونے والے علمی مضامین ادب کے تہذیبی اور ادبی انداز کو ملحوظ رکھنے والے تنقیدی مضامین، کشاکش حیات کی ترجمانی کرنے والے افسانے، ڈرامے اور معنی خیز نظمیں بھیجیں اور قارئین اپنے تعمیری ردعمل کا اظہار کریں"۔ (۱۶)

عابد سہیل کے اداریوں میں سطحی گفتگو کے بجائے وسیع النظری اور دور اندیشی پائی جاتی ہے۔ وہ وقتی چکاچوند میں گم سم نہیں ہوتے بلکہ لمحے بھر کی رنگارنگی کو پر رونق کہکشاں بنانے کی فکر کرتے ہیں جس کی ضوفشانی دیر پا اور دور رس ثابت ہو۔ اس حوالے سے ان کے وہ اداریے کافی اہم ہیں جو ملک گیر سطح پر غالب صدی منائے جانے کے قریب شائع ہوئے۔ غالب صدی کو یادگار بنانے کے لئے ایک قومی کمیٹی تشکیل دی گئی جس کی صدر وزیر اعظم اندرا گاندھی تھیں۔ ظاہر ہے اس کے انتظامات کے لئے ایک بڑی رقم مختص کی گئی ہوگی ساتھ ہی غالبیات کی اشاعت

سے لیکر مشاعروں اور کانفرنسز کا اہتمام بھی بڑے زور وشور سے کیا جا رہا ہوگا۔ ان سب چکا چوند میں عابد سہیل اپنے نومبر 1968 کے اداریے میں ان پہلوؤں کی طرف توجہ مبذول کراتے ہیں جس میں مختص رقم کو مزید بہتر طور پر استعمال کیا جا سکے۔ ان کے منصوبوں کو انھیں کے انداز میں دیکھیں۔

> ”اس وقت سب سے اہم کام یہ ہے کہ حکومت اور دوسرے اداروں اور افراد سے جشن غالب کے سلسلے میں جو امداد اور مراعات مل سکیں ان کو اس طرح استعمال کیا جائے کہ زبان کو دور اور دیر تک فائدہ پہونچے۔ معلوم ہوا ہے کہ ریاستی کمیٹی لکھنؤ میں غالب اوپن ایر تھیٹر بنانے کی تجویز پر سنجیدگی سے غور کر رہی ہے اور اس تجویز کو حکومت کی حمایت بھی حاصل ہے۔ یہ ایک عمدہ تجویز ہے لیکن اس تھیٹر اور شہر کے دوسرے تھیٹروں میں کیا فرق ہوگا؟ کیا اس کی آمدنی غالب کی زبان کی ترقی و بقا کے لئے استعمال کی جائے گی؟ اگر تجویز کے محرکین نے مسئلہ کے اس پہلو پر غور کر لیا ہے اور وہ اس سلسلے میں مطمئن ہیں تو ہمیں کچھ نہیں کہنا لیکن اگر یہ یا اس قسم کی اور کوئی چیز نہ ہوئی تو غالب تھیٹر بھی ایسے نمائشی کاموں میں جن کے ہم عادی ہو چکے ہیں محض ایک عددی اضافہ ہوگا۔ اس وقت شہر کو ایک اردو لائبریری کی بیش از بیش ضرورت ہے اور ہمارے خیال میں اس کی افادیت غالب تھیٹر سے کہیں زیادہ ہوگی۔ اگر مالی وسائل دونوں کے کفیل ہو سکیں تو کیا خوب ورنہ ہمارے خیال میں اردو لائبریری کا قیام زیادہ مفید ہوگا۔“ (۱۷)

عابد سہیل کی یہ رائے نہایت مفید ہے کیونکہ ایک لائبریری کا قیام کئی نسلوں کی آب یاری کر سکتی ہے جب کہ تھیٹر اور دیگر پروگرام کی حقیقت وقتی لطف اندوزی یا پھر شعلہ مستعجل سے زیادہ نہیں۔ اس اداریہ کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ آج کے پس منظر میں بھی یہ بالکل تر وتازہ اور کارآمد نظر آئے گا۔ موجودہ دور میں بھی ایک ایسی لائبریری کی اشد ضرورت ہے جس سے اردو کے اسکالر استفادہ کر سکیں۔ ویسے کہنے کو تو یہاں کئی لائبریریز ہیں لیکن وہ وقت کے حالات کے مطابق کتنی ”اپڈیٹ“ ہے اس کا اندازہ تشنگان علم کو بخوبی ہے۔

بہر حال غالب صدی منائی گئی، کئی مضامین شائع ہوئے، کئی کتابیں منصۂ شہود پر آئیں، بہت سی کانفرنسز منعقد ہوئیں، غالبیات میں اضافے ہوئے۔ لیکن عابد سہیل نے رسماً کوئی گفتگو نہیں کی تھی اسی لئے اس ملک گیر جشن کے بعد انھوں نے پھر اپنے اداریے میں اس طرف توجہ دلائی اور کئی اہم سوالات قائم کرتے ہوئے لکھا

"غالب صدی تقریبات ختم ہو چکی ہیں اور اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ ہم غالبؔ اور
غالبؔ کی زبان کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟ ان تقریبات سے غالبؔ دوبارہ
زندہ ہو گئے یا ہم نے ان کی لاش کو اور زیادہ گہرا گاڑ دیا؟ اور کیا ہم سو سال بعد
جس ہندوستان کا تصور کر سکتے ہیں اس میں غالب اور غالب کی زبان کو اتنی
پذیرائی حاصل ہوگی کہ ہم اس قسم کی تقریبات کا تصور بھی کر سکیں؟ یہ اور اس قسم
کے سوالات کا جواب ہی مستقبل کے ہندوستان کی تشکیل بھی کرے گا اور یہ تشکیل
ہی ان سوالات کا جواب بھی دے گی۔" (۱۸)

ایسا ہرگز تصور نہ کیا جائے کہ وہ اس طرح کے پروگرامز کے خلاف تھے اور اسی لئے صرف منفی فکر کے تحت اداریہ لکھ رہے تھے۔ انھوں نے اپنے اداریوں میں توازن کا بھرپور خیال رکھا ہے۔ جہاں مذکورہ بالا سوالات قائم کئے یا پھر آگے چل کر غالب کو سوشلسٹ، کمیونسٹ اور متشاعر ثابت کرنے پر اظہار افسوس کیا وہیں یہ بھی لکھا

"۔۔۔اس دوران غالب پر کچھ اچھا کام بھی ہوا اور غالب کے طفیل ملک کی غیر
اردو داں آبادی کے ایک بڑے حصہ کو اردو شاعری اور زبان کی روح سے واقف
ہونے کا موقع ملا۔ ان لوگوں سے قطع نظر جن کا دین ایمان ہی اردو کے ساتھ
تعصب برتنا ہے، ہندی لکھنے پڑھنے اور بولنے والے عوام نے شائد پہلی بار
محسوس کرنا شروع کیا ہے کہ ایسی خوبصورت اور سجل زبان سے محرومی خود اپنے
آپ سے محرومی ہوگی۔" (۱۹)

ایک ماہر اداریہ نگار کی طرح انھوں نے اس جشن کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا اور اداریہ کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اس کے بعد کے مقصد کو بھی بیان کیا

"۔۔۔اصل سوال یہ ہے کہ ہم اس فضا کو جو غالبؔ تقریبات کی وجہ سے ملک
میں پیدا ہوئی ہے اردو زبان کے تحفظ کی جدوجہد میں کس طرح استعمال کر سکتے
ہیں۔" (۲۰)

ان کے اداریے محض "کیا ہوا" یا "کس طرح ہوا" پر ختم نہیں ہوتے بلکہ مسئلہ کے ممکنہ حل کی تلاش بھی ان کے یہاں نظر آتی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ حل کا متلاشی اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک وہ مسئلہ کی تہہ تک جا کر اس "خشت اول" کو نہ ڈھونڈ نکالے جسے شروع میں ٹیڑھا رکھا گیا ہو۔ عابد سہیل اپنے اداریوں میں "دیوار کج"

پر بے باک تبصرہ بھی کرتے ہیں اور" خشت اول" کے ٹیڑھ پن کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔ان کی یہ بے باکی اس وقت مزید دھاردار ہوجاتی ہے جب وہ اردوزبان کے مسائل پر گفتگو کرتے ہیں۔ یوں تو متعدد اداریے انھوں نے اردو کے مسائل سے متعلق لکھے ہیں مثلاً اگست 1971 کے شمارہ کا اداریہ اردوزبان کے ایک اہم مسئلہ سے متعلق ہے جس میں یہ خبر دی گئی ہے کہ وزیراعظم کے اعلان کے بعد ریاسی حکومت اردو اکادمی کے قیام اور محکمہ تعلیم میں ڈپٹی ڈائرکٹر (اردو) کی تقرری کا منصوبہ بنارہی ہے۔ساتھ اس کا یہ بھی ارادہ ہے کہ جس کلاس میں دس یا چالیس بچے ہیں وہاں اردو کے استاد کی تقرری کو یقینی بنائیں وغیرہ وغیرہ۔ یہاں بھی ایک ذمہ دار اداریہ نگار کی طرح عابد سہیل نے ایک بہت حساس اور قابل غور جملہ تحریر کیا ہے

> "اگر ہم ان مراعات سے فائدہ اٹھا نہ سکے تو اس کی ذمہ داری خود ہماری ہی ہوگی۔ ریاست کے ۶۰ ہزار پرائمری اسکول میں سے اگر ہم دس ہزار اسکولوں میں بھی اردو تعلیم کا انتظام کرا سکے تو یہ ایک بہت بڑی کامیابی ہوگی۔۔۔۔اگر حسب سابق ان مراعات کا دائرہ صرف حکام رس لوگوں تک ہی محدود رہ گیا تو اس کے لئے اکادمی کے ممبروں اور اردو کی ترقی میں سرگرم دلچسپی لینے والوں کے علاوہ اور کسے ذمہ دار قرار دیا جا سکے گا؟ حکومت کو بہر حال ہرگز نہیں"(۲۱)

اس کے فوراً بعد آنے والے شمارہ کا اداریہ بھی اردوزبان کے مسائل پر تھا۔لیکن یہاں گفتگو اردو کی کتابوں اور رسالو کے حوالے سے تھی۔اردو کتابوں اور رسالوں کی حالت، ان کی اشاعت،فروخت اور ذراسی مقبولیت پر خوش فہمی کا بیان جس دردمندی اور صدق دلی سے کیا گیا ہے وہ محل افسوس بھی ہے اور قابل غور بھی۔

> "ادبی کتابوں کا تو ذکر ہی کیا جن کی ایک ہزار جلدوں کے چار پانچ برس میں فروخت ہوجانے کو ہم پبلشر اور مصنف کی بہت بڑی کامیابی تصور کرتے ہیں، ہمارے بہترین فروخت ہونے والے ناول نگاروں کی تصنیفات بھی پانچ ہزار سے زائد فروخت نہیں ہوتیں۔"(۲۲)

اس تلخ حقیقت سے عابد سہیل اس لئے آشنا تھے کیونکہ انھوں نے زمانہ طالب علمی سے ہی کتابوں کی فروخت کا تجربہ تھا۔ وہ اردو کی دیگر کتابوں کے علاوہ ترجمہ کئے ہوئے روسی ادبی رسالوں ایک عرصہ تک بیچتے رہے۔اس لئے وہ جانتے تھے کہ دوسری زبان میں شائع ہونے والے غیر ادبی رسالوں کی تعداد اشاعت کا جہاں سے آغاز ہوتا ہے ہم اردو والوں کی کتابیں وہاں تک پہنچنے میں ہی دم توڑ دیتی ہیں۔ایک پبلشر ہونے کی وجہ سے

انھیں کتابوں کے نہ بکنے کا ذاتی تجربہ تھا۔کئی بڑے شعرا کے مجموعوں کی ہزار ہزار کاپیاں چھپوا کر وہ خسارہ برداشت کر چکے تھے۔اسی لئے وہ تمام پبلشر سے یہ سوال کرتے ہیں

"آخراس صورت حال کا سبب کیا ہے اور کیا کبھی اردو کے ناشروں نے سر جوڑ کر بیٹھنے اور سوچنے کی کوشش کی کہ ان حالات کا ذمہ دار کون ہے؟"(۲۳)

عابد سہیل کا ماننا ہے کہ "زبان صرف ادب نہیں"۔اگر کوئی اردو زبان سے دلچسپی رکھتا ہے اور ادب سے نہیں تو اس کے لئے ہمیں دوسرے موضوعات مثلاً عمرانیات،نفسیات،تاریخ،جغرافیہ اور میڈیکل سائنس وغیرہ کو بھی اردو کے پیکر میں ڈھالنا ہوگا۔ہم اس کے ساتھ یہ زبردستی نہیں کر سکتے کہ وہ اردو میں صرف افسانے،غزلیں یا ڈرامے ہی پڑھ سکتا ہے۔ یہ ایک بہت اہم مسئلہ ہے جس کی طرف دالرترجمہ کے بعد سے ابھی تک توجہ نہیں دی گئی ہے جس کے باعث اردو زبان کا دامن ادبی مواد کے علاوہ دوسرے موضوعات سے خالی ہے۔ان کے نزدیک

"زبان صرف ادب کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتی۔زبان اس وقت تک پھل پھول نہیں سکتی جب تک ہم اسے ضرورت کی زبان نہ بنا دیں اور جب تک اردو کو ضرورت کی زبان نہ بنایا جائے گا بہترین ادب،سرکاری امداد، پرجوش کارکنوں کی کوششیں اور اپیلیں اسے ہرگز زندہ نہ رکھ سکیں گی۔"(۲۴)

عابد سہیل کتنے دوراندیش تھے یہ اداریہ اس کا ثبوت فراہم کر رہا ہے۔آج صورت حال بالکل یہی ہے کہ مشاعروں اور سیمینار پر اس قدر توجہ دی جارہی ہے کہ دیگر ضروری کام پس پشت چلے گئے ہیں۔دھیرے دھیرے ہر جگہ سے اردو آسامیاں کم ہو رہی ہیں حد تو یہ ہے کہ وہ کالجز اور اسکول جہاں اردو زبان پڑھائی جاتی تھی کئی برسوں سے اسٹوڈنٹس نہ ہونے کی وجہ سے اردو کا شعبہ کو بند کر دیا گیا ہے۔اس کی وجہ یہی ہے کہ "اردو کو ضرورت کی زبان" بنانے میں ہم ناکام ہیں جس کی طرف آج سے پچاس سال قبل عابد سہیل اشارہ کر چکے ہیں۔

زمانہ کے ساتھ زندگی کا بدلنا فطری عمل ہے اور زندگی کے ساتھ ادب کا تبدیل ہونا ادب کی بقا کے لئے لازمی فعل۔عصری میلانات وترجیحات کے پابند ہوئے بغیر حالات حاضرہ کے مسائل کو بیان کرنا ایک سنجیدہ ادیب کی ذمہ داری ہے یہ ذمہ داری اس وقت شدید ہو جاتی ہے جب زندگی کے ہر شعبہ میں ہلچل نظر آرہی ہو۔عابد سہیل اپنے اداریہ میں ادیب کو اس کی ذمہ داری کا احساس بھی دلاتے ہیں

"آج ہندوستان میں جن متضاد وسیاسی رجحانات اور فکری میلانات کا اظہار کیا جا

رہا ہے۔ہمیں ان میں سے کسی نہ کسی سے ذہنی طور پر وابستہ ہونا ہی پڑے گا۔
ہماری قوت ممیزہ کو اس آزمائش سے گزرنا پڑے گا کہ ہم کن خیالات کو کن
دوسرے خیالات پر ترجیح دیتے ہیں۔ ہم یہ کہہ کر ادیب نہیں بنے رہ سکتے کہ
ہمارے لئے تمام صورتیں یکساں ہیں اور ہر راستہ ایک ہی طرف لے جانے والا
ہے، ہر خیال درست ہے اور ہر نقطہ نظر برابر ہے۔ہم کسی کو ترجیح دے کر اپنے کو
پابند نہیں بنانا چاہتے یہ خودفریبی ہے اور وہ بھی مصنوعی قسم کی۔ کیونکہ ہماری ادبی
زندگی ہماری پوری زندگی سے الگ نہیں ہوسکتی۔ جو ادیب بے روک فکری
آزادی چاہتے ہیں وہ بھی چند ہی خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں اور اپنی
ترجیحات کے دائرے بنالیتے ہیں اس لئے اس بات کی بڑی ضرورت ہے کہ
عصری زندگی اور ادب کے تعلق پر زیادہ سے زیادہ بحث کی جائے اور جو باتیں
محض علامتوں اور استعاروں میں کہی جاتی ہیں ان کا اظہار برملا بھی
کیا جائے۔'' (۲۵)

عابد سہیل کے اداریے ادبی ہونے کے ساتھ ساتھ اصلاحی اور علمی ہوتے تھے۔ ان میں ادبی رجحانات ، تنقیدی میلانات اور عصری تحریکات کے علاوہ سماج کو بہتر بنانے کی منصوبہ سازی بھی ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اداریے اپنے زمانے کے آئینہ دار محسوس ہوتے ہیں۔ عابد سہیل نے اداریوں کے موضوعات کو اردو کے حدود میں قید نہیں کیا بلکہ غیر اردو ادب اور شخصیات پر بھی لکھا۔ مارچ 1970 کے پہلے ورق کا موضوع ''برٹنراڈ آرتھر ولیم رسل'' ہے جس میں عابد سہیل نے رسل کی شخصیت اور نظریے کو نہایت مختصر اور بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔ کتاب کے بعض اداریوں کو نہ تو گردش ایام گرد آلود کر سکے گی اور نہ ہی امتداد زمانہ اس کی تازگی پر اثر انداز ہو سکے گا۔ عابد سہیل کی یہ تحریریں ہر زمانے کے قاری کو روشن ضمیر بنائیں گی۔

ماہنامہ ''کتاب'' نے جن اصولوں کے ساتھ اپنے سفر کا آغاز کیا تھا اس پر وہ ہمیشہ باقی رہا۔ عابد سہیل نے رسالہ کی اشاعت کے وقت ہی یہ عزم کر لیا تھا کہ کوئی عطیہ قبول نہ کروں گا۔ جس پر وہ آخر تک قائم رہے مگر رسالہ کی مسلسل اشاعت اور ضخامت میں اضافہ نے عابد سہیل کو دوراہوں پہ لا کے کھڑا کر دیا تھا یا تو عابد سہیل اپنی عہدہ کے اثر ورسوخ کی مدد سے محکمہ تعلقات عامہ جو تمام محکموں کے اشتہارات جاری کرتا ہے، کتاب کے لئے بھی اشتہارات حاصل کرتے ،لیکن بقول عابد سہیل ''دماغ میں ایمانداری کا کیڑا رینگا کرتا اور ایم سی کی یہ توقع بھی کہ I hope you will seel the artclis not for your self۔ ہر وقت دل و دماغ پہ پہرا دیتی رہتی۔'' لہٰذا

عابد سہیل نے دوسری راہ اختیار کی اور جولائی 1975 کو کتاب کا ضخیم الوداعی رسالہ شائع کر کے اسے الوداع کہہ دیا اور ایسا شاید پہلی مرتبہ ہوا کہ ایک ایک قارئین کی باقی ماندہ زرسالانہ رقم 2 مہینہ کے اندر واپس کر دی گئی۔ الوداعی شمارہ کی ضخامت بھی دو ڈھائی سو صفحات سے کم نہ تھی۔ چودہ ساڑھے چودہ سو کاپی چھپوانے کے باوجود بھی تمام لوگوں کو مہیا نہیں کرائی جاسکی۔ اپنی خودنوشت میں وہ لکھتے ہیں

"کتاب کا سلسلۂ اشاعت ختم ہونے کے بہت دنوں بعد اس شعبے (اشتہارات) کے انچارج جو رٹائر ہو چکے تھے، حضرت گنج میں موجودہ یونیورسل بک ڈپو کے پاس والے مندر کے سامنے بس کا انتظار کرتے ہوئے مل گئے۔ انھوں نے "کتاب" کی خیریت دریافت کی اور یہ معلوم ہونے پر کہ اس کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے، ہندی میں کچھ کہا جس کے معنی تھے کہ اب میرا ذریعۂ معاش کیا ہے۔ انھیں یہ معلوم کر کے کہ "کتاب" میرا ذریعۂ معاش نہیں شوق تھا اور میں نیشنل ہیرالڈ کے شعبۂ ادارت سے وابستہ ہوں سخت حیرت ہوئی۔" (۲۶)

ادیبوں اور خاص طور سے افسانہ نگاروں کی اس نسل کا بڑا حصہ جو 1980 کے آس پاس ادب کے افق پر ابھرا بڑی حد تک کتاب ہی کے ذریعہ متعارف ہوا یا پہچانا گیا۔ پروفیسر علی احمد فاطمی اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"رسالہ کتاب کے حوالے سے ایک اور بات جو بیحد اہم ہے اور جس کو میں پوری ایمانداری اور ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں وہ یہ کہ کتاب نے نئے لکھنے والوں کی بیحد ہمت افزائی کی۔ میرے بعض سینئر احباب فکشن نگار شوکت حیات، حسین الحق، عبدالصمد وغیرہ کہتے ہیں کہ انھیں یا تو رسالہ آہنگ نے متعارف کرایا یا کتاب نے بہ الفاظ دیگر کلام حیدری اور عابد سہیل نے اور یہ بات صد فی صد درست ہے اس لئے کہ ان دونوں نے مجھے بھی متعارف کرانے اور ادبی دنیا میں پیش کرنے میں بیحد تعاون کیا۔" (۲۷)

ماہنامہ 'کتاب' نے تقریباً 13 سال تنقیدی اور نئے رجحانات و مسائل پر مشتمل مضامین اور خصوصی نمبروں و گوشوں کی اشاعت سے اردو ادب کی ناقابل فراموش خدمت انجام دی ہے جس نے اردو کی ادبی روایت کو مستحکم کیا ہے۔ شمیم حنفی اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں

> "کتاب" نے لکھنؤ کے ادبی معاشرے میں ایک طرح کی مرکزی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ ہندوستان، پاکستان کے بہت سے نئے لکھنے والے اس شہر خوبی کو "کتاب" کی اشاعت کے زمانے تک صرف اس کے ماضی کی آنکھ سے نہیں دیکھتے تھے۔ "کتاب" اس عہد کے ادبی شعور کی ایک زندہ علامت تھی۔ اس رسالے نے ہمارے ادبی سفر اور روایت کے ایک رفتار پیما کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔" (۲۸)

جن ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات "کتاب" میں شائع ہوتی تھیں ان میں سے چند ایک کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں

حیات اللہ انصاری، گیان چند جین، شمس الرحمان فاروقی، عابد سہیل، قرۃ العین حیدر، نیر مسعود، عرفان صدیقی، علی عباس حسینی، شارب ردولوی، کملیشور، سید محمد عقیل، منموہن تلخ، سردار جعفری، عصمت چغتائی، قاضی عبدالستار، شمیم حنفی، کرشن چندر، حامد کاشمیری، جوگندر پال، ندا فاضلی، سریندر پرکاش، خلیل الرحمان اعظمی، انور عظیم، اقبال مجید، غیاث احمد، اقبال متین، عمیق حنفی، اسلم پرویز، ہری شنکر پرسائی، نشیکانت، شرد جوشی، سہیل عظیم آبادی، قمر احسن ، جون ایلیا، شہریار، رام پرکاش راہی، عادل منصوری، وسیم بریلوی، انیس اشفاق، مظفر حنفی، سلام مچھلی شہری، الیاس فرحت، نریش کمار شاد، شہاب جعفری، سلطان سبحانی، ویریندر، یوسف ناظم، باقر مہدی مظہر امام، شاذ تمکنت، بلراج کومل، شاہد ماہلی، راج نرائن راز، غلام ربانی تاباں، بشیر بدر، نامی انصاری، وہاب دانش، انیس الرحمان، احسن رضوی، شاہد عزیز، اسرار عظمت، منظر سلیم، کمار پاشی، رباب رشید، اعجاز اختر، سلام فردوسی، زاہدہ زیدی، ڈاکٹر صفدر آہ، زیب غوری، سلمی جاوید، مظہر امام، رحمان جامی، غلام مرتضیٰ راہی، فضیل جعفری، مسیح الحسن رضوی، منظر کاظمی، رام لعل، محمد ایاز، ، ظ۔انصاری، شکیلہ اختر وغیرہ

☆ علیم شناسی اور عابد سہیل

عابد سہیل کی طبیعت پر جن چند شخصیات نے گہرے نقوش ثبت کئے تھے ان میں ڈاکٹر عبدالعلیم کا نام سر فہرست ہے۔عبدالعلیم عابد سہیل کے رشتے کے ماموں تھے۔بچپن سے ہی عابد سہیل ان کی فعالیت اور قابلیت سے متاثر تھے بلکہ متاثر کی جگہ" مرعوب" لفظ کا استعمال کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔عبدالعلیم ترقی پسند تحریک کے نظریہ سازوں میں تھے اور عابد سہیل اس تحریک کے سرگرم رکن۔تحریک کے تئیں ان کا مخلصانہ رویہ اراکین کے جوش و ولولہ کو ہمیشہ گرم رکھتا۔صرف تحریک کے اراکین ہی نہیں بلکہ عبدالعلیم کی سادہ مزاجی اور علمی شخصیت نے ایک عالم کو ان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ان کی خاموش طبیعت میں فکر و دانشوری کا ایک سمندر موجزن تھا۔تفکرات کے اس عمیق سمندر میں نئے سماج کی تعمیر اور مستقبل کی ترقی کا خزانہ پوشیدہ تھا۔لیکن یہ جواہرات ان کی زندگی اور انتقال کے کچھ عرصہ بعد تک قرطاس ابیض میں منظم طور پر منتقل نہیں ہو سکے تھے اور یہ ممکن بھی نہیں تھا کہ ڈاکٹر عبدالعلیم کی تمام تحریروں اور تقریروں کو یکجا کیا جا سکے۔عابد سہیل نے اس قبیل قدم اٹھایا اور ان جواہر پاروں کو مختلف کتب کے ذریعہ عوام کی خدمت میں پیش کیا۔اس حوالے سے ان کی مرتب کردہ کتابوں میں عبدالعلیم کی منتخب تحریریں (2008)، ہندوستانی ادب کے معمار: عبدالعلیم 2008 (مونوگراف) علیم شناسی (2012) کلیات عبدالعلیم دوجلدیں (2012) کے علاوہ مضامین اور کھلی کتاب میں شامل خاکہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

☆ **"عبدالعلیم کی منتخب تحریریں"** اس کتاب میں حالات زندگی، ایک خط: ڈاکٹر اعجاز حسین کے نام، ڈاکٹر ذاکر حسین کے خطوط اور دیباچہ سمیت کل 23 تحریریں شامل ہیں۔جس میں ڈاکٹر عبدالعلیم کے تنقیدی، ادبی، سیاستی، تاریخی، ملی، اسلامی مضامین شامل ہیں۔ادب کے حوالے سے" ادبی تنقید کے بنیادی اصول" اور" اردو ادب کے رجحانات پر ایک نظر" کافی اہم ہیں۔

"ادبی تنقید کے بنیادی اصول" میں عبدالعلیم نے چند ایسے اصول وضع کرنے کی بات کہی ہے جس سے موافق و مخالف دونوں اپنی اپنی باتیں سمجھا سکیں۔انھوں نے تنقید و تحقیق دونوں میں سائنسی نقطہ نظر کی تائید کی اور اپنی اس تحریر کو بھی معروضی اور سائنسی انداز میں پیش کیا ہے۔سب سے پہلے تحقیق کی وضاحت پیش کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ

"علمی تحقیق کا بنیادی اصول یہ ہے کہ محقق کو اپنی خوش کلامی یا استدلالی کے رو سے
اپنی بات منوانے کی کوشش نہ کرے بلکہ تجربات اور مشاہدات کو اس طرح پیش
کرے کہ ان کو سامنے رکھ کر ہر شخص وہی نتیجہ نکالنے پر مجبور ہو جو خود اس نے
نکالے ہیں۔"(۲۹)

مصنف اور قاری کے اقسام شمار کئے ہیں اور آخر میں تمام پہلوؤں کے مدنظر تنقید کے اصول وضع کئے ہیں۔
یہ اقتباس دیکھیں جس میں چند ضروری باتیں قلمکار نے جمع کر دیں

"ادبی تنقید کا مقصد یہ ہے کہ ادب کو پڑھنے والوں کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے،
جو ادیب سنجیدہ پڑھنے والوں کو اپنا مخاطب بنانا چاہتا ہے اس کے لئے ضروری
ہے کہ وہ انسانی زندگی کی کشمکش کی تصویر کھینچے اور جہاں تک ممکن ہو پڑھنے والوں
کے تجربات اور مشاغل زندگی سے لگاؤ پیدا کرے تا کہ انسانی ماحول کا مکمل
خاکہ سامنے آسکے۔ ناقد کا فرض ہے کہ وہ ادبی کارناموں کو اس معیار سے
جانچے۔ ناقد اور عام پڑھنے والوں میں یہی فرق ہے کہ ناقد کی نظر زیادہ وسیع
ہوتی ہے، وہ ذاتی پسند اور لطف اندوزی سے قطع نظر کر کے ایک مستقل معیار قائم
کرنے کی کوشش کرتا ہے۔"(۳۰)

یہ مضمون تنقید کے اصول اور تحقیق کی جہات دونوں کو بیان کرتا ہے۔

اس کتاب کا آغاز عابد سہیل کے ایک طویل دیباچہ سے ہورہا ہے۔جس میں عابد سہیل نے عبدالعلیم کی زندگی خصوصاً ان کی سرگرمیوں اور مصروفیتوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ 1932 سے لیکر جب عبدالعلیم پی۔ایچ۔ڈی کی سند کے ساتھ ملک واپس آئے تھے ان کی آخری عمر تک کے اہم واقعات کو مرتبِ کتاب نے سند کے ساتھ درج کر دیا ہے۔اُن واقعات پر توجہ زیادہ دی ہے جو سیاست یا سنداں سے متعلق ہیں یا پھر نظریاتی طور پر ان اہمیت حاصل ہے۔جامعہ کی پہلی معائنہ کمیٹی کا بھی ذکر ہے جس کے تحت پیش کی گئی رپورٹ کے نتیجہ میں پہلی بار استادوں کے دو گریڈ بنے۔ایک میٹرک پاس اساتذہ کے لئے دوسرا بی۔اے پاس اساتذہ کے لئے۔(مرتب کے مطابق گمان غالب یہی ہے)

اسی سال ہونے والی ایک زبردست بحث کا بھی ذکر ہے جو تقریباً ڈھائی مہینے جاری رہی۔اس بحث کو "تاریخی بحث" سے موسوم کیا گیا۔اس بحث کا صحرا بھی عبدالعلیم کے سر جاتا ہے کیونکہ

”یہ بحث 14 اکتوبر کو شروع ہوئی تھی۔ بحث کا موضوع تھا” جامعہ اپنے مقصد سے ہٹتی جا رہی ہے“۔ تجویز پیش کرتے ہوئے برکت صاحب نے موضوع کا تعارف کرایا۔ تقریر کرنے کے لئے جوں ہی عبدالغفار مدھولی صاحب اٹھے، ڈاکٹر عبدالعلیم نے کہا” قطع کلام جناب صدر“۔ ذاکر صاحب نے کہا۔” فرمائیے“ ،تو انھوں نے کہا۔ آج کے موضوع پر بحث کرنا اس وقت آسان رہے گا جب یہ معلوم ہو جائے کہ جامعہ کا مقصد کیا ہے۔“(۳۱)

جب مدھولی صاحب اس موضوع پر تقریر کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے تو ڈاکٹر عبدالعلیم نے خود اس موضوع پر خطبہ دیا۔ جس کے بعد یہ طے پایا کہ سبھی اساتذہ بیان کریں کہ ان کے نزدیک جامعہ کے مقاصد کیا ہیں۔ تقریر کرنے کے لئے قرعہ ڈالا جاتا اور اگلے دن وہی استاد تقریر کرتا۔ اس طرح یہ بحث” تاریخی بحث“ بن گئی۔ ترقی پسند تحریک کی کانفرنسز کا ذکر کو کافی اہمیت دی گئی ہے اور یہ ناگزیر بھی تھا کیونکہ عبدالعلیم کی عمر کا ایک بڑا حصہ تحریک کی خدمت میں صرف ہوا تھا۔ اس بیان سے صرف عبدالعلیم کی زندگی ہی پر روشنی نہیں پڑتی بلکہ ترقی پسند تحریک کے مدھم نقوش بھی نمایاں ہو جاتے ہیں۔

ان کی ملازمت کے سلسلہ میں عابد سہیل نے کافی تفصیل سے لکھا ہے خصوصاً علی گڑھ یونیورسٹی کی وائس چانسلرشپ، جامعہ سے متعلق ان کی خدمات اور ترقی اردو بورڈ کے تحت انجام پانے والی کارروائیوں کو نمایاں کیا ہے۔ اس کتاب کا وہ حصہ بھی بہت اہم ہے جس میں عبدالعلیم کی غریب پروری اور انسان دوستی کی نادر مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً انتقال کے دو سال بعد ان بیواؤں کو خطوط آنے لگے جن کو عبدالعلیم منی آرڈر بھیجا کرتے تھے اور اس کا علم ان کے گھر والوں کو بھی نہیں تھا۔ عابد سہیل نے ڈاکٹر عبدالعلیم کے انتقال کے 32 سال بعد 2008 میں اس کتاب کو ترتیب دے کر انھیں دوبارہ زندہ کر دیا اور یہ زندگی ان کی ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔

☆ ہندوستانی ادب کے معمار: عبدالعلیم (مونوگراف)

مونوگراف میں تفصیل کی گنجائش، خاکے سے ذرا زیادہ ہوتی ہے اور چونکہ عابد سہیل خاکہ نویسی میں ماہر تھے اس لئے ایک یادگار مونوگراف لکھنا ان کے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ لیکن ایسے شخص کے بارے میں مختصراً بیان کرنا مشکل ہو جاتا ہے جس سے رشتہ جذباتی ہو اور قدم قدم پر یاد آنے والی کرم فرمائی قلم کے آگے واقعات کا ڈھیر لگا دیں۔ عابد سہیل کے ساتھ ڈاکٹر عبدالعلیم کا رشتہ بھی کچھ اسی نوعیت کا تھا۔ اس کے باوجود عابد سہیل کا قلم واقعات

کی کھتونی سے ان شہ پاروں کونشان زد کرنے میں کامیاب رہا جس سے عبدالعلیم کو جانا، پہچانا اور سمجھا جا سکے۔

مصنف نے اختصار سے ضرور کام لیا ہے مگر جزیات نگاری کو ترک نہیں کیا۔ یہاں تک کہ لکھنؤ میں عبدالعلیم کی تمام قیام گاہ، شام کی ان کی مصروفیات جیسے ٹینس، کرکیٹ کھیلنا وغیرہ کو بھی بیان کیا ہے۔ "حیات وشخصیت" کے پہلے باب میں ذاتی اور ابتدائی معلومات فراہم کی ہے جسے سے عبدالعلیم کی طبیعت وذہانت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالعلیم 5 اگست 1907 میں پیدا ہوئے حالانکہ سرکاری دستاویزات پر سن 1906 درج ہے۔ وہ غازی پور کے ایک گاؤں پہیتا کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد مولوی عبدالعظیم ایک بہت قابل وکیل تھے۔ ان کے بزرگوں کا سلسلہ حضرت عبیداللہ احرار سے ملتا ہے۔ عبدالعلیم نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ ہائی اسکول بلیا کے گورنمنٹ ہائی اسکول سے کیا۔ بی اے آنرز جامعہ ملیہ اور پی ایچ ڈی برلن سے مکمل کی۔ برلن روانگی سے قبل ان کی شادی گورکھپور کے ایک قاضی خاندان کی خاتون سے کردی گی۔ تعلیمی سفر میں انھیں جن تجربوں سے گزرنا پڑا وہ معمولی یا عمومی نہیں تھے۔ مثلاً گاندھی جی کی تحریک سے متاثر ہو کر گونمنٹ کالج میں پڑھنے سے انکار کردینا، پھر مشروط ہائی اسکول پاس کرنا، پی ایچ ڈی میں تمام کام مکمل ہونے کے بعد ممتحن کا انتقال ہو جانا اور دوسے موضوع کا ازسرنو مطالعہ کرنے کے بعد دوبارہ مقالہ ترتیب دینا وغیرہ۔

یہ باب 31 صفحات پر مشتمل ہے جس میں عابد سہیل نے بہت جامع انداز میں ڈاکٹر عبدالعلیم کی ذاتی زندگی کو بیان کیا ہے۔ پڑھتے وقت محسوس ہی نہیں ہوتا کہ کب ڈاکٹر عبدالعلیم بلیا سے ہائی اسکول پاس کر کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بن گئے۔ ان کا انتقال 18 فروری 1976 کو ہوا۔ یہ قوم کا کتنا بڑا خسارہ تھا اس کا اندازہ عابد سہیل کے اس اقتباس سے ہوتا ہے۔

> "انتقال کی خبر پھیلتے ہی وزارتِ تعلیم کے سارے دفاتر، علی گڑھ اور دہلی کی یونیورسٹیاں اور ان سے متعلق تعلیمی ادارے سوگ میں بند کردئے گئے۔ صدر جمہوریہ فخرالدین علی احمد اور وزیراعظم اندرا گاندھی نے علم وفضل اور ملک وقوم کے لئے ان کی خدمات کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا اور کمیونسٹ پارٹی نے ملک میں روشن خیالی اور ترقی پسندی کو عام کرنے کے لئے ان کی خدمات کو عقیدت کا کراج پیش کرتے ہوئے اپنا پرچم نیم سرنگوں کردیا۔"(۳۲)

ترقی پسند تحریک کے نظریہ سازوں میں سجاد ظہیر، محمود الظفر، رشید جہاں وغیرہ کا ذکر ترجیحی طور پر ملتا ہے مگر عبدالعلیم کی خدمات پر خاطر خواہ گفتگو نہیں ہوتی۔ یہ کتاب ترقی پسند تحریک اور عبدالعلیم کی خدمات کے بارے میں

بھی بہت کچھ وضاحتیں پیش کرتی ہیں۔عابد سہیل نے عبدالعلیم کے ایک انٹرویو جو خلیل الرحمان اعظمی، وحید اختر اور شہر یار نے لیا تھا کے حوالے سے لکھا ہے کہ

"میں (عبدالعلیم) ابتدا ہی سے ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گیا تھا۔ 1935 میں جب انجمن کے قیام کا مسئلہ زیر بحث تھا تو میں بھی اس گفتگو میں شریک تھا۔ 1936 میں جب کانفرنس ہوئی اس میں میں نے بھی شرکت کی تھی۔ترقی پسند تحریک کا پہلا منشور تیار کرنے میں بھی میں نے حصہ لیا تھا۔" (۳۳)

عبدالعلیم نے تحریک کی خدمات نہایت خلوص کے ساتھ انجام دیں۔تمام جلسوں میں وہ شریک رہتے۔اپنی غیر معمولی صلاحیت اور دانشورانہ فکر کے سبب تحریک کے ضوابط میں تبدیلی اور پروگرام کی منصوبہ سازی میں ان کی رائے کو کافی اہمیت حاصل رہتی۔ان کی قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے سجاد ظہیر روشنائی میں لکھتے ہیں

"آئین کو ٹھیک سے مرتب کرنے کا کام اور گزشتہ برسوں کے تجربوں سے جو ترمیمیں ضروری سمجھی گئیں انھیں لکھنے کا کام ڈاکٹر علیم نے انجام دیا۔ہم میں سے وہی سب سے زیادہ منطقی اور سلجھا ہوا ذہن رکھتے تھے۔" (۳۴)

ڈاکٹر عبدالعلیم 'کام' کرنے قائل تھے، انھیں نام ونمود سے سروکار نہیں تھا۔اسی لئے ترقی پسند تحریک کی ہر کانفرنس میں اہم کردار نبھانے کے باوجود تحریک کو اپنی بڑائی اور نمائش کا ذریعہ نہیں بنایا۔ یہ کتاب انہیں پوشیدہ خدمات پر روشن ڈالتی ہے۔بقول مصنف

"ڈاکٹر عبدالعلیم کا شمار ان معدودے چند نقادوں میں ہوتا ہے جنھوں نے ترقی پسند ادبی تنقید کی معیار بندی کی۔ ان کی حیثیت ایک منادی اور نظریہ ساز کی ہے۔" (۳۵)

اس کتاب کا ایک بہت قیمتی حصہ "فکر ونظر" عنوان کے ضمن میں تحریر کیا گیا ہے۔جس میں عبدالعلیم کے مضامین سے ان کے نظریے کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔عابد سہیل چونکہ خود ایک ناقد تھے اور نظریات کی طرفداری میں وہ خاصے متشدد تھے تاہم توازن کا دامن ان کے ہاتھ سے کبھی نہیں چھوٹا۔اسی توازن نے انھیں عبدالعلیم کی تحریروں کو پڑھنے اور سمجھنے پر راغب کیا۔ادب کی جمالیات اور افادیت جیسے حساس اور پیچیدہ موضوع پر عبدالعلیم نے تفصیلی بحث کی ہے لیکن نتیجہ فقط چند جملوں میں بیان کردیا۔ان کے نزدیک "حسن کے لئے لازمی ہے کہ افادہ

میں تبدیل ہو سکے اور وہی چیز زیادہ حسین ہے جو زیادہ مفید بھی ہے۔" یا اسی طرح وہ اس بات سے اختلاف کرتے ہیں کہ مارکسزم انسانیت کے تہذیبی ورثے کی قدر نہیں کرتا ان کا ماننا ہے کہ وہ ایسے ماضی کو رد کرتا ہے جو یاس پسندی کی طرف لے جاتا ہو اور ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھنے کے سوا کوئی درس نہیں دیتا۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نے ادب پر اثر انداز ہونے والے رجحانات اور اس کے سیاسی اور سماجی نتائج کا بھی جائزہ لیا۔ اس مضمون میں انھوں نے بے باکی سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے یہ واضح اشارہ دیا کہ خلافت کی تحریک اور اقبال کی شاعری نے ہندوستان کے مسلمانوں میں غیر معمولی سیاسی شعور ضرور پیدا کیا لیکن ساتھ ہی مذہبی شدت اور علاحدگی کے تصور کر بھی جنم دیا۔ ان کو یہ کیفیت ابوالکلام اور ظفر علی خاں کے یہاں بھی نظر آئی۔ اقبال کی شاعرانہ اور فلسفیانہ حیثیت کے تو وہ قائل ضرور ہیں لیکن ان کے خیال میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی الگ الگ قومیت اور ہندوستانی مسلمانوں میں اپنی الگ سلطنت قائم کرنے کا جذبہ ان کی شاعری ہی سے پختہ ہوا۔

عابد سہیل نے عبدالعلیم کے اہم مضامین جیسے مارکسزم اور ادب، اردو ادب کے رجحانات پر ایک نظر، ترقی پسند ادب کے بارے میں چند غلط فہمیاں، ادب کا مستقبل، ادبی تنقید کے بنیادی اصول اور مسلم یونیورسٹی نیا دور وغیرہ میں پوشیدہ نظریات کو روشن کیا ہے۔ اس سے نہ صرف ادب کے بنیادی مسائل اور استعمال ہونے والی اصطلاعات وغیرہ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے بلکہ ادب اور تنقید دونوں کی افہام و تفہیم کے نئے زاویے بھی روشن ہوتے ہیں۔

عبدالعلیم کے خطبات و تقاریر کے علاوہ اس کتاب میں موجود "ایک اہم تبصرہ" بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے، جو عبدالعلیم نے "انگارے" پر کیا ہے۔ ماہنامہ جامعہ کے 1933 (فروری) شمارے میں شائع ہونے والا یہ تبصرہ عبدالعلیم کی ابتدائی لسانی خصوصیات اور تحریر میں پائی جانے والی ظرافت کی ہلکی آنچ کی انوکھی مثال ہے۔ اس تبصرے کی تلاش اور یافتگی کی کہانی بھی بہت دلچسپ ہے۔ اس تبصرے میں ضمناً احتیاجِ تنقید اور انداز تنقید پر بھی گفتگو ملتی ہے۔ یہ سطریں ملاحظہ کیجیے جس میں کس حسین انداز میں عمیق مطالب پرو دیے گئے ہیں

> "تنقید کی آزادی نہ ہو تو اصلاح کی گنجائش نہیں رہتی اور وہ نخوت اور تکبر جو تنقید کو توہین، اختلاف کو عداوت اور خیالات کے بے تکلف اظہار کو بدتمیزی قرار دے، خلوص اور سچی عقیدت کا سب سے کٹر دشمن ہے۔ لیکن اس پر غور کرنا زندگی کے ہر مصور کا فرض ہے کہ تنقید اور نکتہ چینی کا اس نے جو انداز اختیار کیا ہے وہ اس کے مطلب کو پورا کرتا ہے یا نہیں۔" (۳۶)

عبدالعلیم اپنی بصیرت آمیز نظر اور عاقبت اندیش فکر کے سبب تمام حلقوں میں مقبول رہے۔ سیاست اور ادب میں یہ مقبولیت زیادہ تھی، کیونکہ یہاں جدید نظریوں اور نئے منصوبوں کی مانگ رہتی۔ عبدالعلیم تحریک خلافت ، کانگریس سوشلسٹ پارٹی، کمیونزم وغیرہ سے وابستہ رہے۔ برطانوی سامراج کی مخالفت میں انھیں جیل بھی جانا پڑا۔ جہاں پنڈت جواہر لال نہرو اور سروجنی نائیڈو سے ملاقات ہوئی۔ 1936 کے بعد سے وہ کلی طور پر کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہو گئے تھے اور آخر وقت تک اس کے سرگرم رکن رہے۔ بقول عابد سہیل

"وہ (عبدالعلیم) ڈرائنگ روم والے کمیونسٹ نہیں تھے۔" (۳۷)

یہ مونوگراف علیم شناسی میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم کی ذاتی زندگی سے لیکر ان کے نظریات اور مصروفیات تمام پہلوؤں کو عابد سہیل نے مختصر الفاظ میں سمیٹ دیا ہے۔ کتاب کے آخری حصہ میں عبدالعلیم کے ہم عصر ادیبوں اور دانشوروں کی رائے بھی درج ہے۔ یہ اعتراف حق بہ جانب ہے کہ "مونوگراف عبدالعلیم" کے بغیر مکمل علیم شناسی کا تصور ممکن نہیں۔

☆ **کلیات عبدالعلیم دو جلدیں (2012)**۔ سن 2012 میں عبدالعلیم کی دستیاب تمام تحریروں کو عابد سہیل نے یکجا کیا جسے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے شائع کر کے ایک قابل ستائش کام انجام دیا۔ اس وقت کونسل کے ڈائرکٹر خواجہ اکرام تھے۔ انھوں نے اپنے پیش لفظ میں لکھا

"۔۔۔ دو جلدوں پر مشتمل "کلیات عبدالعلیم" کی اشاعت کو تاخیر سے ادائے فرض کی ایک نا تمام کوشش سمجھنے کے باوجود ہم اس پر نازاں بھی ہیں۔" (۳۸)

بلا شبہ یہ بات وجہ افتخار تھی کیونکہ جن تحریروں کو جمع کیا گیا ہے وہ چند عرصہ بعد معدوم ہو جاتیں جس طرح عبدالعلیم کی دیگر نایاب نگارشات زیر گرد گم ہو گئیں۔ ان مضامین کو چھ زمروں مقالات، زبان کے مسائل، مسلم یونیورسٹی، سرسید، ذریعہ تعلیم، تاریخ، نقطہ نظر، مقالات و کتب (اسلامیات) میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلی جلد 27 مضامین پر مشتمل ہے۔ اس جلد میں ڈاکٹر عبدالعلیم کا تحقیقی مقالہ "عقیدہ اعجاز قرآن کی تاریخ" بھی شامل ہے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم کمیونسٹ حامی تھے مگر اسلامیات پر ان کی گہری نظر تھی۔ اگر چہ چند مسائل پر ان کے نظریات سے اختلاف ممکن ہے (مثلاً وحی رسول کے متعلق) مگر ان کے عمیق مطالعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ سیرت نبویؐ پر ولہاوزن کے اعتراضات کے مدلل جواب پر مشتمل کتاب "سیرت نبوی اور مستشرقین" کو بھی اس کتاب میں جگہ دی گئی ہے۔

عرض مرتب میں عابد سہیل نے ڈاکٹر عبدالعلیم کی زندگی کو روشن کیا ہے بعض واقعات وہی ہیں جو مرتب نے دیگر کتب میں درج کئے ہیں تاہم بعض باتیں معلومات میں مزید اضافہ کرتی ہیں۔ مثلاً جب وہ بطور وائس چانسلر مقرر ہوئے تو سمسٹر سسٹم کو نافذ کیا، پرانی تصاویر ونقشوں کی مدد سے یونیورسٹی کے بانی سر سید احمد خاں کی قیام گاہ کو اصل صورت میں نوتعمیر کرانے کی کوشش، یونیورسٹی کے طبیہ کالج میں بیچلر آف یونانی میڈیسن کے پانچ سالہ کورس کے بعد کی تعلیم کا بندوبست (ہندوستان کے کسی اور طبیہ کالج میں اس وقت یہ انتظام نہیں تھا) وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر عبدالعلیم نے یونیورسٹی کے درجہ چہارم کے ملازمین کی ملازمتیں مستقل کردیں جو ایک سال سے زائد اپنی خدمات انجام دے رہے تھے، اور یہی قانون نافذ ہو گیا۔ خواتین کے لئے بھی پانچ فیصد نشستیں محفوظ کر دیں اور یہی صورت اقوام درج فہرست کے لئے اختیار کی۔

عبدالعلیم نے ترقی اردو بورڈ کے بیورو کی حیثیت سے فرہنگ آصفیہ چھاپی، انگریزی اردو انگریزی لغات اور اردو انسائیکلو پیڈیا کا ڈول ڈالا، دہلی اور اردو کے علاقوں میں کتابت کے اسکول کھولے، املا کی معیار بندی کا کام تقریباً مکمل کر دیا اور مختلف علوم کی کئی اہم کتابوں کے تراجم کرائے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ڈاکٹر عبدالعلیم بورڈ کے پہلے ایسے چیئر مین تھے جو مرکزی حکومت کے وزیر نہ تھے ورنہ ان سے قبل وزیر تعلیم ہی چیئر مین ہوتے تھے۔

عابد سہیل کی تحریر "عرض مرتب" کے بعد پروفیسر محمود الحق کا وقیع مضمون "ڈاکٹر عبدالعلیم اور علوم اسلامیہ کا مطالعہ" شامل اشاعت ہے۔ اس مضمون میں عبدالعلیم کے اسلامی نقطہ نظر کو ان کی تحریروں کی روشنی میں اجاگر کیا گیا ہے۔

دوسری جلد میں ترجمے، تبصرے، تقریریں، خطبات خطوط، سیاسی تجزیے اور پیش لفظ وغیرہ کو شامل کیا ہے اور عرض مرتب کے عنوان سے عابد سہیل کی مختصر تحریر بھی ہے۔ ظاہر ہے جلد اول میں ایک وقیع مضمون کے بعد دوسری تحریر میں بہت کچھ لکھنے کی گنجائش کم ہو جاتی ہے اسلئے اس تحریر میں عبدالعلیم کی شامل اشاعت شذرات پر گفتگو ملتی ہے نیز اس بات کا بھی علم ہوتا ہے کہ ماہنامہ جامعہ میں اسلامی ممالک اور ہندوستان کی سیاسی ہلچل پر عبدالعلیم کے تبصرے "ع ع" نام سے شائع ہوتے۔ چند تبصرے صرف "ع" اور بعض مضامین عبدالعلیم احراری کے نام سے بھی ملتے ہیں۔ جلد کے تعارفی کلمات خود مرتب کی زبانی ملاحظہ کیجئے

"زیر نظر جلد میں عبدالعلیم کے تراجم، اردو ادب اور اسلامیات سے متعلق مدون کتابوں اور مختلف تصانیف کے حرف اول، خطبات اور تقریروں، خطوط،

متفرقات سرگرمیوں کی رودادوں، کرشن چندر اور خلیل الرحمان اعظمی کے مضامین اور جلد اول کے مقالات کے مطالعے سے ان کی علمی، ادبی حصولیابیوں اور فکر و نظر کی وسعت کے علاوہ شخصیت کے کئی پہلوؤں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔"(۳۹)

اس جلد میں ادبی عنوان پر کی جانے والی تقاریر بہت اہم ہیں جن کا عنوان ہے غزل: ہیئت اور موضوع، ترقی پسند ادب، جدیدیت، ادب، زندگی، حقیقت نگاری، ادب میں جمود، یہ تقریر نما تحریریں اس دور کے ادب کا بیانیہ ہیں جب سیاسی اتھل پتھل، تہذیبی زوال، سماجی کشمکش اور اردو کی زبوں حالی سے ادب دو چار تھا۔ زندگی کے پیمانے بدل رہے تھے اور ادیب کے قلم کو اسیر بنانے کوششیں جاری تھیں۔ یہ شور وغل ادب کے قدیم ڈھانچے کو تبدیل کرنے کی دستک دے رہا تھا۔ ڈاکٹر عبدالعلیم کی قوت انجذاب اِس ماحول میں ابھرنے والے مسائل کو بھانپ چکی تھی اور آئندہ منازل کی دشواریوں سے نپٹنے کے لئے سامان فراہم کر رہی تھی۔ یہی سبب ہے کہ ان تقریروں میں ایک منظم لائحہ عمل ہے جو صرف ادب کی سمتوں کی تعیین نہیں کرتا بلکہ سماج کی بہتری اور ملک کی ترقی کی طرف رہنمائی بھی کرتا ہے۔

☆ **علیم شناسی:** اس کتاب میں ڈاکٹر عبدالعلیم کے نظریات وشخصیات اور ان کے پسندیدہ عناوین پر اہل قلم حضرات نے مضامین لکھے ہیں۔ عابد سہیل نے اس کتاب کو 2012 میں ترتیب دیا۔ اس میں مرتب کی دو تحریریں شامل ہیں۔ عرض مرتب کے عنوان سے لکھی تحریر میں مشمولات کتاب پر تبصرہ کیا ہے اور بعض مضامین کا تجزیہ بھی کیا ہے نیز مضمون نگار کے ذریعے ڈاکٹر عبدالعلیم پر کئے گئے اعتراضات کے جوابات بھی دئے ہیں۔ حالانکہ یہ محل اعتراض کا جواب دینے کا نہیں تھا کیونکہ "عرض مرتب" عنوان کے تحت کتاب کے اشاعتی مقاصد، موصولہ مضامین کی افادیت، معاونین کی سپاس گذاری وغیرہ کی گنجائش تو ہوتی ہے، مگر "مہمان قلمکار" کی تحریر پر "میزبان" کی تکلف سے خشک راست گوئی "مکروہ" نہ سہی "ترک اولیٰ" ضرور معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً پروفیسر بیگ احساس کے مضمون کے بارے میں عابد سہیل لکھتے ہیں

پروفیسر بیگ احساس علیم صاحب کے علم وفضل کے قائل ہیں اور ان کے مضمون "مارکسزم اور ادب" کو اس موضوع پر لکھے جانے والے چند اہم مضامین میں شمار کرتے ہیں لیکن وہ ان کے اس اصرار سے کہ "ماضی کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش لاحاصل ہے۔" متفق نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس خیال کو "قرۃ العین

حیدر، انتظار حسین، خالدہ حسین اور نیر مسعود جیسے فنکاروں نے غلط ثابت کیا ہے۔"(۴۰)

یہاں تک مضمون کے تعلق سے تشریحی گفتگو کی گئی ہے اور دونوں (پروفیسر بیگ احساس اور ڈاکٹر عبدالعلیم) کے نظریات کو پیش کر دیا ہے جو ایک مرتب کی حیثیت سے موصلہ مضمون پر بہترین تبصرہ تصور کیا جاتا ہے۔ عابد سہیل اس اقتباس کے بعد تحریر کرتے ہیں

"پروفیسر بیگ احساس کا یہ اعتراض ہرگز ایسا نہیں کہ اسے آسانی سے درگذر کر دیا جائے مگر علیم صاحب نے یہ بھی تو کہا ہے کہ" ہم ماضی کو مثال کے طور پر سامنے رکھ سکتے ہیں، اس سے عبرت و بصیرت حاصل کر سکتے ہیں لیکن اگر ہم یہ چاہیں کہ ماضی کی قدروں کو ہو بہو اس دور میں نافذ کر دیں تو ہماری یہ کوشش الٹی گنگا بہانے کی سی ہوگی۔"(۴۱)

حالانکہ عابد سہیل نے اس کے بعد اس جملہ سے کہ" بہر حال یہ موضوع گہرے غور و فکر کا متقاضی ہے" یہ بات صاف کر دی کہ" این جائے بحث نیست"۔

عابد سہیل کا اعتراض درست ہے مگر کیا" عرض مرتب" میں کسی معترض کے اعتراض کو معترض الیہ کی جانب سے Defend کرنا" وکالت" میں شمار نہیں ہوگا؟ اس کے لئے الگ سے ایک مکمل مضمون لکھنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ عبدالعلیم کے تئیں یہ وکالت عابد سہیل کی پرجوش عقیدت کو بیان کرتی ہے۔ وضاحت میں پروفیسر علی احمد فاطمی کی تحریر کردہ چند سطریں پیش خدمت ہیں

۔۔۔اچانک ان پر ڈاکٹر عبدالعلیم کا دورہ پڑ گیا۔۔۔۔علیم شناسی کے تمام ریکارڈ توڑ دیے۔ ایک زمانہ میں وہ اٹھتے بیٹھتے بس علیم صاحب کا ہی ذکر کرتے۔ ایک بار تو یہاں تک کہہ ڈالا کہ لندن کی ایک رات دراصل علیم صاحب کا لکھا ہوا ناول ہے۔ ہم ان کی اس علیم نوازی پر حیران ہو جاتے کبھی کبھی پریشان بھی ان باتوں سے قطع نظر انھوں نے علیم شناسی کا حق تو ادا کیا ہی۔"(۴۲)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عابد سہیل ڈاکٹر عبدالعلیم سے کس قدر متاثر تھے۔ اسی لئے عبدالعلیم سے متعلق جب قلم اٹھاتے ہیں تو عقیدت کا رجحان ان کی تحریروں میں صاف نظر آنے لگتا ہے۔

عبدالعلیم کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ اسلامیات، تاریخ، ادب، صحافت جیسے اہم موضوعات کے

علاوہ عملی زندگی میں بہ یک وقت مختلف محاذ پر ثابت قدم رہے۔ دبیز پرتوں میں ڈھکی ان کی شخصیت کو چند کتابوں سے آشکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ اس حوالے سے مبسوط اور منظم طور پر تحقیقی کام کئے جائیں اور نئی جہات کی تلاش کے علاوہ گمشدہ مواد کا بھی سراغ لگایا جائے تا کہ علیم شناسی کے توسط سے ادب کو بھی وسعت حاصل ہو سکے۔

حواشی

(۱)اردوادب میں طنزومزاح،ڈاکٹروزیرآغا،مکتبہ عالیہ لاہور1977ص310

(۲)اردوصحافت کی تاریخ،نادرعلی خاں،ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ،1987،ص10

(۳)(اردوصحافت کی تاریخ1822سے1857تک،نادرعلی خاں،ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ1987،ص160)

(۴)اردوصحافت کی تاریخ،نادرعلی خاں،ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ،1987،ص33

(۵)تاریخ صحافت اردوجلداول،امدادصابری،دہلی1953صفحہ56

(۶)(ماہنامہ کتاب کی کہانی،عابدسہیل نیادوراردوصحافت نمبر،صفحہ223)

(۷)(ماہنامہ کتاب،لکھنؤ1966،ص95)

(۸)(جویادرہا،عابدسہیل،اردواکادمی دہلی2012،صفحہ435)

(۹)جویادرہا،عابدسہیل،صفحہ433

(۱۰)ایضاً(صفحہ225)

(۱۱)(ماہنامہ کتاب،اپریل1963،ص50)

(۱۲)ماہنامہ کتاب لکھنؤ،فروری1969،تلخ،تند،شیریں،صفحہ5

(۱۳)کتاب لکھنؤسالنامہ1967،ص8

(۱۴(کتاب شمارہ مارچ1967،صفحہ3

(۱۵)کتاب،شمارہ مارچ1968،صفحہ3

(۱۶)کتاب،شمارہ مارچ1968،صفحہ4

(۱۷)(کتاب،نومبر1968،صفحہ3)

(۱۸)(کتاب،پہلاصفحہ،اپریل1970)

(۱۹)(کتاب،پہلاصفحہ،اپریل1970)

(۲۰)(کتاب،پہلاصفحہ،اپریل1970)

(۲۱)(کتاب،اگست1971،پہلاصفحہ)

(۲۲)(کتاب،ستمبر1971،ص3)

(۲۳)(کتاب،ستمبر1971،ص3)

(۲۴)(کتاب،ستمبر1971،ص3)

(۲۵)(کتاب فروی،1970ص1)

(۲۶)جویادرہا،عابدسہیل،اردواکادمی دہلی2012،صفحہ438

(۲۷)(عابدسہیل،صبیحہ انور(مرتبہ)،اترپردیش اردواکادمی لکھنؤ،2019،صفحہ67)

(۲۸)(عابد سہیل بند کتاب کے کھلی کتاب تک،شکیل احمد (مرتبہ)،ایم آر پبلی کیشنز 2016،صفحہ 164
(۲۹)(عبدالعلیم کی منتخب تحریریں،مرتب عابد سہیل،ص16-17 نیشنل بک ٹرسٹ 2008)
(۳۰)(عبدالعلیم کی منتخب تحریریں،مرتب عابد سہیل،صفحہ 29 نیشنل بک ٹرسٹ 2008)
(۳۱)(عبدالعلیم کی منتخب تحریریں،مرتب عابد سہیل،صفحہ 18 نیشنل بک ٹرسٹ 2008)
(۳۲)(ہندوستانی ادب کے معمار عبدالعلیم صفحہ 44،ساہتیہ اکادمی نئی دہلی،2008)
(۳۳)(بحوالہ ڈاکٹر علیم سے دو ملاقاتیں۔ماہنامہ کتاب لکھنو،ہندوستانی ادب کے معمار عبدالعلیم صفحہ 47،ساہتیہ اکادمی نئی دہلی،2008)
(۳۴)(ہندوستانی ادب کے معمار عبدالعلیم صفحہ 50،ساہتیہ اکادمی نئی دہلی،2008)
(۳۵)(ہندوستانی ادب کے معمار عبدالعلیم،حرف اول،ساہتیہ اکادمی نئی دہلی،2008)
(۳۶)(بحوالہ ماہنامہ جامعہ فروری 1933،ہندوستانی ادب کے معمار عبدالعلیم صفحہ 122،ساہتیہ اکادمی نئی دہلی،2008)
(۳۷)(ہندوستانی ادب کے معمار عبدالعلیم صفحہ 103،ساہتیہ اکادمی نئی دہلی،2008)
(۳۸)(کلیات عبدالعلیم،جلد اول،پیش لفظ،مرتب عابد سہیل،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان 2012)
(۳۹)(کلیات عبدالعلیم جلد دوم صفحہ 17،مرتب عابد سہیل،قومی کونسل برائے فروغ اردو بان 2012)
(۴۰)علیم شناسی صفحہ 13
(۴۱)علیم شناسی صفحہ 14
(۴۲)(عابد سہیل،ڈاکٹر صبیحہ انور (مرتبہ)،اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ 2019،صفحہ 75-74)